ڈاکٹر عبادت بریلوی

یارانِ دیرینہ

اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ

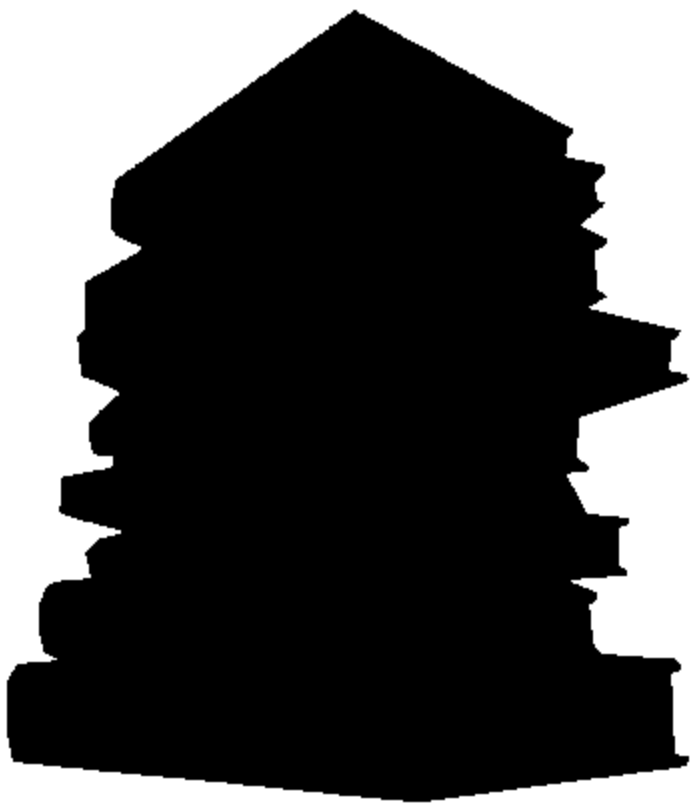

Marfat.com

Marfat.com

ڈاکٹر عبادت بریلوی

یارانِ دیرینہ

اِدارۂ ادب و تنقید ○ لاہور

Marfat.com

130282

تصنیف : یارانِ دیرینہ
مُصنف: پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی
ناشر: فریدالدین، ناظم ادارۂ ادب و تنقید لاہور
مطبع : لاہور آرٹ پریس، لاہور
کتابت : سیّد محمد ابراہیم خوش نویس جامعہ اشرفیہ لاہور
سرورق: سیّد انور حسین شاہ نفیس رقم
اہتمام: سیّد محمد ابراہیم
جلدسازی: مدنی بک بائنڈنگ ہاؤس لاہور
تاریخ اشاعت : اکتوبر ۱۹۸۸ء
تعاون : اکادمی ادبیات پاکستان
قیمت : ستّر روپے

Marfat.com

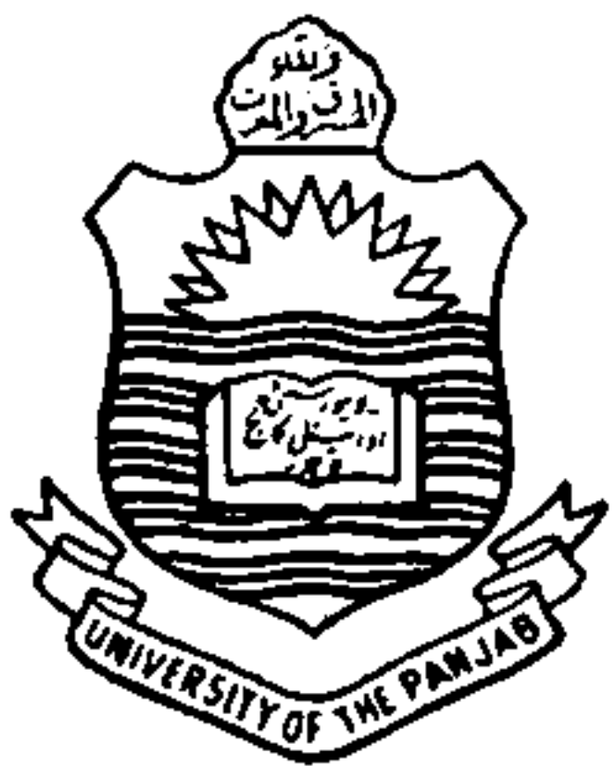

مرحوم

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

کی

یاد میں

○

حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراجِ خزاں
آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا

○

(حضرت خواجہ میر درد دہلویؒ)

عبادت بریلوی

Marfat.com

○

اے فراقِ تو یارِ دیرینہ
غم تو غمگسارِ دیرینہ

دردِ تو مہمان ہر روزہ
داغِ تو یادگارِ دیرینہ

○

حضرت امیر خسرو دہلویؒ

Marfat.com

فہرست

		صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱	میاں بشیر احمد	۹
۲	شاعر پاکستان ابوالاثر حفیظ جالندھری	۲۷
۳	ڈاکٹر سید عبداللہ	۴۱
۴	پروفیسر سید وقار عظیم	۵۷
۵	پروفیسر سید وزیر الحسن عابدی	۷۱
۶	مولانا نور الحسن خاں	۹۱
۷	ڈاکٹر عبداللہ چغتائی	۱۰۱
۸	ڈاکٹر برکت علی قریشی	۱۰۹
۹	ڈاکٹر صابر علی خاں	۱۲۱
۱۰	میاں مہر دین	۱۳۱

Marfat.com

Marfat.com

پیش لفظ

میری آپ بیتی "یادِ عہدِ رفتہ" شائع ہوئی تو غالباً اُس کو اسی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کہ اُس میں گذشتہ نصف صدی کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، ذہنی، فکری، علمی، تعلیمی اور ادبی ماحول کے ذکر کے ساتھ اس عہد کی اہم شخصیتوں کا تذکرہ بھی تھا لیکن ظاہر ہے کہ ان اہم شخصیتوں کے خدوخال کی تفصیل اس میں نہیں سما سکتی تھی۔ اس میں تو اختصار کے ساتھ کچھ اشارے ہی کئے گئے تھے، جن سے ان بزرگوں اور دوستوں کی صرف ایک جھلک دیکھی جا سکتی تھی۔

اس لئے میں نے یہ سوچا کہ اِن شخصیتوں کے خدوخال کی تفصیل کو خاکوں کے چند مجموعوں کی شکل میں پیش کر دیا جائے تاکہ ان اہم شخصیتوں سے صحیح طور پر آشنا ہونے کا موقع ملے، اور اور جو کارہائے نمایاں انہوں نے اسلامیانِ پاکستان و ہند کی تاریخ و تہذیب میں انجام دیئے ہیں، وہ سامنے آسکیں۔ چنانچہ اسی خیال سے میں نے اِن خاکوں کے سات مجموعے (۱) رہ نوردانِ شوق (۲) آوارگانِ عشق (۳) جلوہ ہائے صد رنگ (۴) یارانِ دیرینہ (۵) بلاکشانِ محبت (۶) غزالانِ رعنا اور (۷) شجر ہائے سایہ دار طباعت و اشاعت کے لئے تیار کئے۔

رہ نوردانِ شوق، آوارگانِ عشق، اور جلوہ ہائے صد رنگ تو کئی سال ہوئے، شائع ہو چکے ہیں۔ "یارانِ دیرینہ"، "بلاکشانِ محبت"، "غزالانِ رعنا" اور شجر ہائے سایہ دار پریس میں ہیں، اور انشاء اللہ جلد شائع ہو جائیں گے۔

ان میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد،

Marfat.com

حضرت جگر مُرادآبادی، حضرت جوش ملیح آبادی، علامہ نیاز فتح پوری، ابوالاثر حفیظ جالندھری، فیض صاحب، مصوّر مشرق عبدالرحمٰن چغتائی، میاں بشیر احمدؒ، پروفیسر حمید احمدؒ خاں، جناب صوفی تبسّم، میراجی، مجاز، ناصر کاظمی، حبیب جالب، محمدؐ حسن عسکری، ڈاکٹر برکت علی قریشی، ڈاکٹر عبداللہ، پروفیسر سیّد وقار عظیم، علامہ سیّد وزیر الحسن عابدی، مولانا نورالحسن خاں، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر صابر علی خاں، مولانا صلاح الدین احمدؒ، پروفیسر عزیز احمدؒ، میاں ام-اسلم، پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر سیّد احتشام حسین، سید آغا حسن عابدی، پروفیسر مرزا محمود بیگ، ڈاکٹر خورشید احمد فارق اور بہت سے دوسرے بزرگوں اور دوستوں کے خاکے قابل ذکر ہیں۔ یہ خاکے کوئی ہزار ڈیڑھ ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔

یارانِ دیرینہ" کے نام سے اس وقت جو مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے، وہ اورینٹل کالج کے رُفقائے کار اور اُن احباب کے حالات پر مشتمل ہے جن کو اورینٹل کالج سے دلچسپی تھی اور جو کسی نہ کسی نسبت سے اورینٹل کالج کے ساتھ تعلق رکھتے تھے۔

میں نے بہ حیثیت یونیورسٹی پروفیسر، صدر شعبۂ اُردو، پرنسپل اورینٹل کالج، ڈین اورینٹل اینڈ اسلامک لرننگ، اور ڈائرکٹر شعبۂ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند عمر عزیز کے تقریباً تیس بتیس سال اورینٹل کالج میں گذارنے، اور مختلف اوقات میں جن احباب کے ساتھ مجھے اس ادارے کے مِنّت پذیر شانہ گیسوؤں کو سنوارنے کا موقع مِلا، اُن کی شخصیتوں کی چلتی پھرتی تصویریں میں نے اِن خاکوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اِن میں کوئی اور خوبی ہو یا نہ ہو، یہ خوبی ضرور ہے کہ اِن سے اورینٹل کالج کی گُذشتہ نصف صدی کی تاریخ، اور بین الاقوامی شہرت کے اس ادارے کی تعلیمی، علمی، ادبی، معاشرتی اور تہذیبی ماحول اور فضا کا ایک نقشہ آنکھوں کے سامنے ضرور آجاتا ہے۔

اور یہی اِن خاکوں کی ترتیب و تالیف اور طباعت و اشاعت کا بنیادی مقصد ہے:

عبادت بریلوی

۲۱-سی، یونین پارک، جمن آباد، لاہور
۷ ستمبر ۱۹۸۹ء

Marfat.com

میاں بشیر احمدؒ

میاں بشیر احمدؒ مرحوم بڑے ہی وضع دار، مرنجاں مرنج، انسان دوست، مخلص اور محبت والے انسان تھے۔ علم و ادب سے دلچسپی اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ عرصۂ دراز تک اُردو کے مشہور رسالے ہمایوںؔ کے اڈیٹر رہے۔ یہ رسالہ انہوں نے اپنے والد محترم جسٹس میاں محمدؒ شاہ دین ہمایوں کی یاد میں نکالا تھا جو ایک زمانے تک اُردو ادب کی خدمت میں سرگرم عمل رہا، اور جدید دور کے بے شمار ادیب اُس میں مضامین لکھ لکھ کر ادب کی دُنیا میں ایک بلند مقام پر پہنچے۔ وہ بڑے ہی متوازن اور اعتدال پسند شخصیت کے مالک تھے، اور اس توازن اور اعتدال پسندی نے اُن کے ہر کام کو چار چاند لگا دیئے تھے۔

میاں صاحب کا تعلق لاہور کے ایک مشہور و معروف علمی گھرانے سے تھا۔ اُن کے والد محترم جسٹس میاں محمدؒ شاہ دین ہمایوں لاہور ہائی کورٹ کے جج تھے، اور قیام پاکستان سے قبل ہندوؤں کے زمانے میں بھی انہیں عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ اعلےٰ درجے کے شاعر بھی تھے۔ اُن کا کلام معاصر رسالوں میں بڑے اہتمام سے شائع ہوتا تھا۔ سر شیخ عبدالقادر کے رسالے "مخزن" میں اُن کی نظمیں اور غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ علامہ اقبالؒ نے ان کے بارے میں ایک خوبصورت نظم لکھی تھی جس سے ان کی شخصیت کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ نظم اُن کے پہلے مجموعۂ کلام بانگ درا میں شامل ہے۔ علامہ لکھتے ہیں ؎

Marfat.com

اے ہمایوں! زندگی تیری سراپا سوز تھی
تیری چنگاری چراغِ انجمن افروز تھی
گرچہ تھا تیرا تنِ خاکی نزار و دردمند
تھی ستارے کی طرح روشن ترا طبعِ بلند
کس قدر بے باک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلۂ گردوں نورد اک مُشتِ خاکستر میں تھا
موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں
شب کی خاموشی میں جُز ہنگامۂ فردا نہیں
موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

میاں بشیر احمدؒ صاحب انہیں میاں شاہ دین ہمایوں کے فرزند ارجمند تھے۔ اُنہوں نے انہیں کے سائے میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آکسفورڈ گئے، اور وہاں کی یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ اس زمانے میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے کسی ہندوستانی کا پہلی ڈگری حاصل کرنا بہت بڑی بات تھی۔ شاید اسی وجہ سے بی اے آکسن ان کے نام کا جزو بن گیا۔ انگلستان کے دوران قیام ہی میں اُنہوں نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا لیکن وطن واپس آکر کبھی باقاعدگی سے بیرسٹری نہیں کی۔ شاید اس کی انہیں ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ رئیس ابن رئیس تھے اس لئے انہوں نے وکالت کے خارزار میں قدم رکھنا پسند نہیں کیا۔ بس علم و ادب کے ساتھ وابستگی پیدا کر لی، اور اپنے والد محترم کی وفات کے بعد انہوں نے رسالہ ہمایوں نکالا جس میں وہ مختلف موضوعات پر مضامین لکھتے رہے۔ اس رسالے کو انہوں نے مُرتب بھی کیا اور اڈیٹر کی حیثیت سے اتنی بڑی تعداد میں مضامین لکھ کر شائع کئے کہ اگر ان کو یکجا کیا جائے تو کئی کتابیں بن سکتی ہیں۔ اُن کا لکھنے کا انداز نہایت شگفتہ اور شاداب تھا، اور اُن کی تحریریں دلوں میں گھر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔

میں طالب علمی کے زمانے سے 'ہمایوں' کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتا تھا۔ ادب سے مجھے

Marfat.com

دلچسپی تھی اس لئے ہمایوں میں شائع ہونے والی ادبی تحریروں کو بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ ان میں میاں بشیر احمدؒ صاحب کی تحریریں بھی شامل تھیں۔ میں نے اُن کا بھی اُس زمانے میں باقاعدگی سے مطالعہ کیا۔ وہ دُنیا کے حالات، بین الاقوامی سیاست اور مُلک کے معاملات پر ادبی رنگ و آہنگ کے ساتھ دلچسپ اور معلومات افزا مضامین لکھتے تھے۔ ادب لطیف کے انداز میں اُن کی کچھ جمالیاتی اور رومانی انداز کی تحریریں بھی میری دلچسپی کا باعث بنتی تھیں، اور مجھے اُن کی اِن تحریروں میں شاعری کا سا لُطف آتا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اُن کے ایک صاحبزادے اصغر بشیر انگلستان کے دوران قیام میں دریا میں ڈوب کر وفات پا گئے تھے۔ میاں صاحب پر ظاہر ہے کہ اس المناک سانحے کا بہت اثر تھا۔ چنانچہ وہ ہمایوں کی ہر اشاعت میں اصغر مرحوم کی یاد میں ایسے مضامین لکھا کرتے تھے جن کا ادبی رنگ و آہنگ دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا تھا، اور اتنا مؤثر تھا کہ ہر پڑھنے والے کو اُداس اور غمگین کر دیتا تھا۔

کم و بیش اسی زمانے میں جب ۱۹۴۱ء میں فانی بدایونی کا انتقال ہوا تو میں نے اُن کی شخصیت اور شاعری پر ایک مضمون لکھ کر میاں صاحب کے نام ہمایوں میں اشاعت کے لئے بھیج دیا۔ اس زمانے میں ہمایوں کے جوائنٹ اڈیٹر مولانا حامد علی خاں صاحب تھے۔ اُنہوں نے مضمون ملتے ہی مجھے خط لکھا۔ مضمون کی تعریف کی اور یہ اطلاع دی کہ میاں صاحب نے اس مضمون کو بہت پسند کیا ہے، اور یہ ہمایوں کی آئندہ اشاعت میں شائع ہو رہا ہے۔ چنانچہ یہ مضمون ہمایوں کے آئندہ شمارے میں (غالباً اگست ۱۹۴۱ء میں) شائع ہو گیا۔ میاں صاحب نے اور مولانا حامد علی خاں صاحب نے اس مضمون کو پسند کیا۔ حالانکہ یہ ایک معمولی طالب علم کی ابتدائی تحریر تھی، اور اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی پختگی کا رنگ اس میں نام کو بھی نہیں تھا۔

اس طرح میاں بشیر احمدؒ صاحب اڈیٹر ہمایوں سے میرا غائبانہ تعارُف ہوا۔ اس کے بعد میں کبھی کبھی ہمایوں میں مضامین لکھتا رہا، اور میاں صاحب کی داد وصول کرتا رہا۔ یہ صورت حال قیام پاکستان بلکہ اُس کے بعد تک قائم رہی۔

قیام پاکستان کے بعد جب میں دِلّی سے لاہور آیا، اور اُردو کے استاد کی حیثیت سے میں

Marfat.com

نے پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں پڑھانا شروع کیا تو میاں صاحب سے میری مُلاقات ہوئی۔ میں نے اُن کو کالج سے فون کیا۔ ملاقات کا وقت لیا، اور سہ پہر کے وقت اُن کی کوٹھی المنظر ۳۲۔لارنس روڈ پہنچ گیا۔ اطلاع کروائی۔ میاں صاحب فوراً ڈرائینگ روم میں تشریف لے آئے، اور بڑی محبت اور تپاک سے ملے۔ گلے لگایا، مصافحہ کیا، اور اپنے ایک ایک انداز سے یہ ظاہر کیا جیسے برسوں کی شناسائی ہے، اور صدیوں کی مُلاقات ہے۔

میاں صاحب کو آج میں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ وہ چھوٹے قد کے دُبلے پتلے مُخنی سے انسان تھے۔ لیکن اس مختصر سے انسان میں بلا کی تہذیب و شائستگی تھی۔ غضب کا جذب و جنوں تھا۔ چہرے کی شگفتگی، آواز کی شائستگی، اور گفتگو کی نرمی سے وہ ایک مکمل اور مثالی انسان معلوم ہوتے تھے۔ باقاعدگی اُن کے ایک ایک انداز سے ٹپک رہی تھی۔ عزم و ارادہ کی پختگی اُن کی شخصیت میں مختلف زاویوں سے اپنا جلوہ دکھا رہی تھی۔

اگرچہ گرمی کا موسم تھا، اور میاں صاحب اپنے گھر میں تھے لیکن اُنہوں نے باقاعدہ سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ سفید قمیص کے سخت کالر پر ٹائی لگا رکھی تھی۔ جوتے اور موزے پہنے ہوئے تھے۔ بال بڑے سلیقے سے بنائے ہوئے تھے۔ اگرچہ چہرے پر عمر کے نشانات نمایاں تھے لیکن لباس کی خوش سلیقگی، انداز گفتگو کی تہذیب و شائستگی اور مِلنے جُلنے کے آداب کی شگفتگی و شادابی اور سنجیدہ مزاج کی طرح داری نے اُنہیں ایک دلکش اور جاذب نظر شخصیت بنا دیا تھا۔

اس پہلی ملاقات ہی میں میں اُن کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا وہ مجھے اچھے انسان معلوم ہوئے اس لئے اُن سے خاصی دیر تک باتیں کرتا رہا۔

میاں صاحب کہنے لگے "یہ بھی پاکستان کی برکت ہے کہ آپ لوگ یہاں آ گئے"۔

میں نے کہا "اس میں کوئی شبہ نہیں میاں صاحب! پاکستان اللہ تعالےٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ میں تو آگ اور خون کے دریاؤں کو پار کر کے یہاں پہنچا ہوں۔ یہاں جو عافیت اور طمانیت کا احساس ہوتا ہے، وہ دُنیا میں کہیں اور نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان تو اب مسلمانوں کے لئے جہنم بن چکا ہے۔ وہاں تو سانس لینا مشکل ہے"۔

میاں صاحب کہنے لگے "آپ بالکل صحیح کہتے ہیں مسلمانوں پر عرصۂ حیات وہاں تنگ ہے۔

Marfat.com

اور حالات ایسے ہیں کہ اس صورت حال میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں"۔

میں نے کہا میری جان بڑی مشکل سے بچی ہے۔ اس میں کسی غیبی طاقت کا ہاتھ تھا۔ دِلّی تباہ ہوگئی۔ ہفتوں گولیاں چلتی رہیں۔ مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہا۔ صدیوں کی آبادیاں اُجڑ گئیں۔ اینگلو عربک کالج، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، مسلم لیگ کا قلعہ اور تحریک پاکستان کا گڑھ تھا، اور ہم لوگ کالج کے اساتذہ اور طالب علم اِس تحریک کے جاں باز سپاہی تھے۔ اس لئے ہم لوگوں پر بار بار حملے ہوئے۔ اِن حملوں میں ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ کے ساتھ فوج اور پولیس بھی شامل ہوگئی۔ وہ تو کہیئے کہ پاکستان کے ہائی کمشنر زاہد حسن صاحب کو اس صورت حال کا علم ہوگیا اور اُنہوں نے اپنے ہاں 'گُل رعنا' میں ہم لوگوں کو بُلا لیا۔ وہاں مسلمان لہولہان آتے تھے۔ اس لئے پُرانے قلعے میں کیمپ قائم کرنے کا کام ہمارے سُپرد کیا گیا۔ ہم نے قلعے میں ایسے ایسے دلدوز مناظر دیکھے کہ الفاظ میں بیان نہیں کئے جا سکتے۔ دیکھتے دیکھتے لاکھوں لٹے پٹے مسلمان اس قلعے میں جمع ہوگئے۔ ہم سے جو کچھ ہو سکا وہ ہم نے کیا۔ ہم پر جو کچھ گذری وہ قیامت سے کم نہ تھی۔ ہندوستان کے وزیر رفیع احمد قدوائی صاحب نے میری جان بچائی۔ وہ بڑے ہی مخلص اور انسان دوست انسان تھے۔ انہوں نے ایک جہاز چارٹر کیا، اور مجھے اس میں بٹھا کر لکھنؤ بھیج دیا۔ اس طرح میری جان بچ گئی۔ اس میں کسی غیبی طاقت کا ہاتھ تھا"۔

میاں صاحب چُپ چاپ میری یہ باتیں سنتے رہے۔ جب میں نے دیکھا کہ اُن کی آنکھوں میں آنسو ہیں تو میں نے موضوع بدلا اور کہا "شکر ہے کہ اب ہم اپنے وطن میں ہیں۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ اب ہم یہاں اطمینان سے رہ سکیں گے"۔

میاں صاحب رقت کے عالم میں بولے "اب آپ اطمینان سے یہاں رہیئے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بے تکلفی سے بتلایئے گا"۔

میں نے کہا "آپ کی وجہ سے مجھے بڑی تقویت ہے۔ جاننے والے میری مدد کر رہے ہیں چند روز میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا"۔

غرض دیر تک ہم لوگ اس طرح کی باتیں کرتے رہے۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد ان سے باتیں کر کے میں نے اجازت لی۔

Marfat.com

اُن کی کوٹھی اُلمنظر بڑی ہی خوبصورت تھی۔ سامنے لارنس گارڈن تھا۔ اس کو پار کر کے مال روڈ پر آیا، اور وہاں سے ٹہلتا ہوا اپنی جائے قیام میکلوڈ روڈ پر پہنچا۔

چند روز کے بعد ایک دن اورینٹل کالج میں میاں صاحب کا فون آیا۔ کہنے لگے "میں بشیر احمد بول رہا ہوں۔ میں نے اگلے ہفتے لاہور کے کچھ احباب کو چائے پر بلایا ہے۔ یہ آپس میں ملنے کا ایک بہانہ ہے۔ ۱۶ر تاریخ کو پانچ بجے میرے غریب خانے پر ضرور تشریف لائیے لاہور کے بیشتر ادیبوں اور دانشوروں سے آپ کی مُلاقات ہو جائے گی۔ اس تقریب کا یہی مقصد ہے"۔

میں نے کہا "میں انشاءاللہ ضرور حاضر ہوں گا"۔

۱۶ر تاریخ کو میں اُلمنظر پہنچا۔ میاں صاحب کوٹھی کے لان میں موجود تھے، اور مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ چائے کا انتظام کوٹھی کے اندر ایک بڑے کمرے میں تھا۔ میں پہنچا تو بڑی محبت سے مجھے اندر لے گئے اور مہمانوں سے میرا تعارف کرایا۔

اس محفل میں جسٹس ایس۔ اے رحمٰن، مصوّر مشرق عبدالرحمٰن چغتائی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مولانا حامد علی خاں، ڈاکٹر عبداللہ، م۔ ش، پروفیسر حمید احمد خاں، مولانا صلاح الدین احمد، حفیظ جالندھری، حمید نظامی، حفیظ ہوشیارپوری اور ناصر کاظمی، کے علاوہ بہت سے نئے ادیب بھی تھے۔ میاں صاحب نے اِن سب سے فرداً فرداً مجھے مِلایا، اور میں ان سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ سب نے میرے ساتھ محبت اور ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس محفل میں چائے کے بعد شعر و شاعری بھی ہوئی۔ کئی پرانے اور نئے شاعروں نے اپنا کلام سُنایا۔ باتیں بھی ہوئیں۔ کوئی دو گھنٹے اِن بزرگوں اور دوستوں کے ساتھ گذار کر اور میاں صاحب کا شکریہ ادا کر کے میں اپنی جائے قیام پر واپس آیا۔

میاں صاحب کی مہمان نوازی نے جی خوش کر دیا۔ اچھا وقت گذرا۔ لاہور کی اہم علمی ادبی شخصیتوں سے ملاقاتیں بھی ہو گئیں۔

اس کے بعد میاں صاحب سے اکثر میری مُلاقاتیں ہوتی رہیں۔ کبھی کبھی وہ خود بہ نفسِ نفیس کالج میں تشریف لے آتے تھے۔ کبھی میں اُن کے پاس اُلمنظر چلا جاتا تھا۔ ان ملاقاتوں میں علمی ادبی باتیں ہوتی تھیں۔ سیاسی حالات کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحثیں ہوتی تھیں

Marfat.com

غرض ان کے ساتھ بہت اچھا وقت گذر جاتا تھا۔

اُس زمانے میں میاں صاحب کا مکان بڑے بڑے قومی لیڈروں کا مہمان خانہ بنا ہوا تھا۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب جب بھی لاہور آتے تھے میاں صاحب کے ہاں قیام کرتے تھے۔ میاں صاحب بابائے اُردو کے پرستار تھے، اور اُردو کی تحریک میں ہمیشہ سے اُن کے ساتھ تھے۔ وہ انجمن ترقی اُردو کی پنجاب شاخ کے صدر بھی تھے۔ اُردو کی ترویج واشاعت کے لئے اُن کے اسی مکان میں بڑے بڑے منصوبے بنائے جاتے تھے۔

میاں صاحب اُردو کے پرستار تھے، اور سمجھتے تھے کہ اُردو کو پاکستان کی قومی زبان ہونا چاہیئے اور تمام پاکستانیوں کو اُردو بولنا، اُردو پڑھنا اور اُردو لکھنا چاہیئے ۔ میاں صاحب نے اپنی کوششوں سے پاکستان میں اُردو کا ماحول پیدا کیا۔ وہ اُردو کو عام کرنے کے لئے بے شمار منصوبے بناتے تھے، اور اُن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی سی پوری کوشش کرتے تھے۔ اس کام میں انہیں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی ۔ اُنہوں نے اپنے رسالے ہُمایوں اور اپنی عملی کوششوں سے اُردو کو خاصا فروغ دیا۔

میاں صاحب تحریک پاکستان کے نامور رہنما تھے۔ قائدِاعظم محمد علی جناح اور نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب سے اُن کے ذاتی تعلقات تھے۔ وہ اِن دونوں کے ہم نوا اور ہمدم و دمساز تھے۔ اُنہوں نے پنجاب میں مسلم لیگ کی تحریک کو آگے بڑھانے اور پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا، اور ملک خضر حیات خاں کی حکومت کے زمانے میں پاکستان کی جو تحریک چلی، اُس میں وہ پیش پیش رہے۔ قائدِاعظم اور نواب زادہ صاحب کو اُن پر پورا بھروسہ تھا، اور وہ دونوں اُن کی بڑی عزت کرتے تھے۔ لیکن میاں صاحب عملی سیاست کے آدمی نہیں تھے۔ وہ بُنیادی طور پر ایک مُفکر، دانشور اور ادیب تھے۔ اسی لئے انہوں نے نہ تو کبھی الیکشن میں حصہ لیا نہ وزیر بننے کے لئے آمادہ ہوئے۔ وہ تو صرف سوچ سکتے تھے، اور صحیح طور پر سوچ سکتے تھے۔ اخلاص اور جذب وشوق ان کی رہنمائی کرتا تھا، اور وہ قومی معاملات میں بڑی ہی دانش مندی اور بصیرت کا اظہار کرتے تھے۔

قائدِاعظم سے اُنہیں جو عقیدت تھی، اس کے نتیجے میں اُنہوں نے قیام پاکستان سے قبل ہی

Marfat.com

اُن کی شان میں ایک نہایت ہی دلکش و دلآویز اور مؤثر نظم لکھی تھی جو اپنی تاثیر کی وجہ سے اُس وقت بھی زبان زدِ خواص و عوام تھی، اور آج بھی بڑے ہی جذب و شوق سے پڑھی جاتی ہے۔ یہ نظم اُن کے دل کی آواز تھی۔ اس لئے ہر ایک پر اثر کرتی تھی، اور دلوں میں جگہ بنا لیتی تھی۔ کیا خوب شعر اُنہوں نے کہے تھے ؎

ملّت کا پاسباں ہے محمّد علی جناح
ملّت ہے جسم، جاں ہے محمّد علی جناح

صد شکر پھر ہے گرم سفر اپنا کارواں
اور میر کارواں ہے محمّد علی جناح

بیدار مغز، ناظم اسلامیانِ ہند
ہے کون ؟ بے گماں ہے محمّد علی جناح

رکھتا ہے دل میں تاب و تواں دس کروڑ کی
کہنے کو ناتواں ہے محمّد علی جناح

رگ رگ میں اُس کی ولولہ ہے حُبِّ قوم کا
پیری میں بھی جواں ہے محمّد علی جناح

لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ جس کا تیر
ایسی کڑی کماں ہے محمّد علی جناح

ملّت ہوئی ہے زندہ پھر اس کی پکار سے
تقدیر کی اذاں ہے محمّد علی جناح

غیروں کے دل بھی سینوں کے اندر دہل گئے
مظلوم کی فغاں ہے محمّد علی جناح

اے قوم! اپنے قائدِ اعظم کی قدر کر
اسلام کا نشاں ہے محمّد علی جناح

لاہور اپنے بخت پہ نازاں ہے کیوں نہ ہو
آج اپنا مہماں ہے محمّد علی جناح

عمر دراز پائے، مسلماں کی ہے دُعا
ملّت کا ترجماں ہے محمّد علی جناح

میاں صاحب کی یہ نظم مسلم لیگ کے اس تاریخی جلسے کے لئے لکھی گئی تھی جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منٹو پارک میں منعقد ہوا تھا، اور جس میں تاریخی قرارداد پاکستان پیش کی گئی تھی۔ میاں صاحب کی یہ نظم اس جلسے میں انور علی نے پڑھی، اور کہا جاتا ہے کہ اس نظم کو سن کر حاضرین میں ایسا جوش اور جذبہ پیدا ہوا تھا، جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اُن کے یہ اشعار ایک زمانے تک اسلامیانِ ہند کی زبان پر رہے، اور آج بھی بڑے جذب و شوق کے ساتھ یہ نظم مختلف مواقع پر پڑھی جاتی ہے۔
قائدِ اعظم پر بے شمار نظمیں گذشتہ نصف صدی میں لکھی گئی ہیں لیکن میاں صاحب کی اس

Marfat.com

نظم میں جو بات ہے وہ کسی اور نظم میں نظر نہیں آتی۔

اس میں شبہ نہیں کہ میاں صاحب سیاسی بصیرت رکھتے تھے، سیاست سے انہیں دلچسپی تھی۔ وہ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے ایک اہم مفکر اور کارکن تھے، لیکن اُن کے مزاج کی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ وہ اس سیاست میں عملی طور پر حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے عملی طور پر سیاست میں حصّہ نہیں لیا۔ پردے کے پیچھے رہ کر پاکستان کے لئے کام کرتے رہے، اور اپنے قلم سے اس تحریک کے لئے انہوں نے بہت کچھ کیا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ دامے، درمے، سخنے اس کام میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

وزارت کو تو انہوں نے ہمیشہ ٹھکرایا، البتہ جب حکومت پاکستان کی طرف سے ترکیہ کی سفارت کی پیش کش ہوئی تو اُنہوں نے اس کو قبول کر لیا، اور وہ تقریباً تین سال تک ترکی میں پاکستان کے سفیر رہے۔ اُنہوں نے ترکی کے دورانِ قیام میں پاکستان کے لئے زندگی کے ہر شعبے میں اہم کارنامے انجام دیئے۔ ترکی اور پاکستان کے برادرانہ تعلقات کو اُنہوں نے ٹھوس اور مضبوط بُنیادوں پر اُستوار کیا۔ خصوصیت کے ساتھ علمی اور تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی روابط کی طرف انہوں نے خاص طور پر توجہ کی، اور دونوں برادر ملکوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا۔

یہ بات میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ گذشتہ تین سال میں نے ترکی کی انقرہ یونیورسٹی میں اُردو اور مطالعہ پاکستان کے پروفیسر کی حیثیت سے گذارے۔ وہاں بڑے بڑے پروفیسروں صحافیوں اور سیاسی رہنماؤں سے میاں صاحب کی سفارت کاری کی تعریف سُنی، اور یونیورسٹی میں تو یہ خیال عام تھا کہ پاکستان کی طرف سے ترکی میں کسی ادیب یا پروفیسر ہی کو سفیر ہونا چاہیئے جیسے کہ میاں بشیر احمدؒ مرحوم تھے۔

میاں صاحب نے ترکی میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے عالموں ادیبوں اور شاعروں سے رابطہ رکھا۔ یونیورسٹیوں میں اُردو اور تاریخ و تہذیب پاکستان کے شعبے قائم کرائے۔ ترکی میں پاکستانی پروفیسر اور پاکستان میں ترکی پروفیسروں کے تقرر کروائے، یونیورسٹیوں کو اُردو کی ہزارہا کتابیں عطیے کے طور پر فراہم کیں جو آج بھی وہاں کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، اور جن سے آج بھی وہاں کے پروفیسر پاکستان اور اُردو زبان و ادب پر کام کرنے کے سلسلے میں استفادہ

Marfat.com

کرتے ہیں۔ میاں صاحب کے بعد ترکی میں پاکستان کا کوئی ایسا سفیر مقرر نہیں کیا گیا، جو علمی و ادبی سطح پر کام کرے۔ بیشتر سفیر نوکر شاہی سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے اُن کا کام صرف فائلوں تک محدود تھا۔ علمی سطح پر کام تو صرف پروفیسر عالم اور ادیب ہی کر سکتا ہے۔

میاں صاحب اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے، اور انہوں نے ترکی اور پاکستان کے باہمی تعلقات کو فروغ دینے کے لئے جو کام کیا ہے، اس کو ہماری تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حرف سے لکھا جائے گا۔

بات یہ ہے کہ میاں صاحب بُنیادی طور پر ایک علمی آدمی اور ایک ادیب تھے۔ ادب کا ذوق اور اس کی خدمت گار جذبہ تو گویا اُن کی گھٹی میں پڑا تھا۔ چنانچہ وہ ہر کام علم و ادب کو سامنے رکھ کر کرتے تھے۔ علم و ادب اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اور وہ ہر وقت علم و ادب کے مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ علمی ادبی معاملات میں حقائق کی تلاش و جستجو کا بھی انہیں بڑا شوق تھا۔ اکثر اوقات فون پر مجھ سے معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔ اس خیال سے کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی تمام کتابیں میری دسترس میں ہیں۔

ایک دن میاں صاحب اورینٹل کالج عمیں تشریف لائے۔ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ اس پر کسی فارسی شاعر کا قطعہ لکھا ہوا تھا۔ بیٹھتے ہی بہ آواز بلند وہ قطعہ پڑھا اور کہنے لگے

"عبادت صاحب! میں آپ سے صرف یہ دریافت کرنے کے لئے آیا ہوں کہ یہ قطعہ کس کا ہے؟ زیب النسار مخفی کا تو نہیں ہے"؟۔

میں نے کہا "مجھے لائبریری جا کر دیکھنا پڑے گا۔ انشاءاللہ کل آپ کو صحیح صورتِ حال سے مُطلع کر دوں گا"۔

میاں صاحب کہنے لگے "کئی دن سے میں اس اُلجھن میں پھنسا ہوا ہوں۔ میرا خیال ہے یہ قطعہ زیب النسار مخفی ہی کا ہے۔ لیکن اس کا جو متن میرے پاس ہے وہ غالباً صحیح نہیں ہے۔ آپ ذرا اصل کتاب دیکھ کر مجھے بتلایئے گا"۔

میں نے کہا "کل انشاءاللہ اس کا صحیح متن آپ کو دیکھ کر بھیج دوں گا"۔

Marfat.com

میاں صاحب تھوڑی دیر بیٹھ کر اور دلچسپ باتیں کر کے رخصت ہوئے تو میں لائبریری گیا۔ کتابیں نکلوائیں۔ قطعہ کا صحیح متن نوٹ کیا، اور واپس آ کر میاں صاحب کو لکھ کر بھیج دیا۔

تیسرے دن میاں صاحب کا خط آیا، لکھا تھا:۔

المنتظر

۳۲-لارنس روڈ، لاہور

۶۷/۲/۲۶

مشفقی ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب، السلام علیکم!

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۴ر فروری ملا۔

معلوم ہوا کہ زیب النسا مخفی کے قطعے کی صحیح صورت کیا ہے۔

میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے یہ زحمت گوارا کی۔

بہرحال آپ نے اور میں نے، دونوں نے، اس قطعے سے بہت لطف اٹھایا۔

والسلام

نیازمند بشیر احمد

متن کے معاملے میں اتنی دلچسپی ایک عالم اور ادیب ہی لے سکتا ہے۔ میاں صاحب جب بھی اس قسم کا کوئی علمی کام میرے سپرد کرتے تھے تو مجھے اس انگریز پروفیسر کا خیال آتا تھا جو جنگ عظیم میں لندن پر بمباری کے دوران بھی رات گئے اپنے دوستوں کو کسی لفظ کی صحت کے بارے میں دریافت کرنے کے لئے فون کرتا تھا، اور کہتا تھا کہ بمباری کو علمی کاموں میں حائل نہیں ہونا چاہیئے۔

میاں صاحب نے 'ہمایوں' کو اڈیٹ کرنے کے لیے ہمیشہ ایک جائنٹ اڈیٹر رکھا۔ منصور احمد، مولانا حامد علی خاں، مظہر انصاری اور ناصر کاظمی سے وہ مختلف زمانوں میں مدد لیتے رہے۔ لیکن انتقال سے پندرہ بیس سال قبل وہ ہمایوں کو خود مرتب کرتے تھے، اور ہر سال اس کا سالنامہ بڑے اہتمام سے شائع کرتے تھے۔ اور اس کے لئے خاص طور پر فرمائش کر کے مضامین لکھوائے تھے۔

۱۹۵۷ء میں انہیں یہ خیال آیا کہ ۵۸ء میں شائع ہونے والے سالنامے میں برعظیم کی

Marfat.com

برگزیدہ اور پسندیدہ شخصیتوں پر مختصر مضامین لکھوائے جائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے مجھے لکھا:

المنظر

۳۲۔ لارنس روڈ، لاہور

۱۶ اپریل ۱۹۵۷ء

مشفقی و مکرمی عبادت صاحب السلام علیکم!

میں نے چند دوستوں سے درخواست کی ہے کہ ہمایوں کے آئندہ سالنامہ کے لئے، جو ۱۹۵۸ء کے شروع میں شائع ہوگا، وہ ایک مختصر مضمون "میری پسندیدہ شخصیت" لکھیں جو پندرہ سو الفاظ پر مشتمل ہو۔ شخصیت تاریخی ہو یا زندہ!

میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ براہ کرم اس موضوع پر کچھ تحریر فرمائیں گے۔ مضمون ستمبر ۵۷ء تک مل جائے لیکن آپ دو تین ہفتے تک اس کا جواب دے سکیں تو میں ممنون ہوں گا۔

آپ کی شرکت ہمایوں کے لئے باعث مسرت ہوگی۔

آپ کا نیازمند

بشیر احمد

یہ خط ملا تو میں نے سوچا کہ میں مولانا حسرت موہانی پر مضمون لکھوں اور اس میں اپنی اُن ملاقاتوں کا ذکر کر دوں جو مولانا سے مختلف اوقات میں ہوئی تھیں، اور جن سے اُن کی عجیب و غریب شخصیت کے بعض پہلوؤں سے مجھے آشنا ہونے کا موقع ملا تھا۔ چنانچہ میں نے یہ ہلکا پھلکا مضمون لکھ دیا، اور سوچا کہ میاں صاحب جب ستمبر میں مری سے واپس لاہور آئیں گے تو خود اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ مضمون پیش کر دوں گا۔

اس عرصے میں مری سے میاں صاحب کا ایک اور خط آیا جس میں اُنہوں نے مضمون کے لئے یاد دہانی کرائی تھی، اور لکھا تھا۔

Marfat.com

مری
۱۴ ستمبر ۵۷ء

مشفقی و مکرمی جناب عبادت صاحب،

سلام مسنون!

آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے گذشتہ اپریل میں آپ کو لکھا تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ براہ کرم ہمایوں کے سالنامے ۵۸ء کے لئے میری پسندیدہ شخصیت پر ایک مختصر مضمون (تقریباً ۱۵۰۰ الفاظ) لکھیں۔ آپ نے ازراہ کرم مولانا حسرت موہانی پر لکھنے کا وعدہ فرمایا تھا۔

میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اپنا مضمون اس ماہ کے اخیر تک لکھ کر مجھے لاہور کے پتے پر (۲۲۔ لارنس روڈ، لاہور) بھیج دیں گے۔ شکریہ!

میں ۲۲/۲۳ ستمبر تک لاہور آ رہا ہوں۔

نیاز مند
بشیر احمدؐ

میاں صاحب کی خواہش تھی کہ میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب پر مضمون لکھوں شاید اس لئے کہ انہیں مولوی صاحب سے میرے تعلقات کا علم تھا، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مولوی صاحب مرحوم کی شخصیت پر میں ایسا مضمون لکھ سکوں گا جس میں کچھ نئی باتیں ہوں گی۔ چنانچہ جب انہیں یہ علم ہوا کہ میں مولوی عبدالحق صاحب کے بجائے مولانا حسرت پر مضمون لکھ رہا ہوں تو انہوں نے مجھے لکھا:۔

المنظر

۳۲۔ لارنس روڈ، لاہور

۱۸ نومبر ۵۷ء

مشفقی و مکرمی، تسلیم

والا نامہ ملا۔

Marfat.com

براہ کرم مضمون بھجوا دیجیے۔ بہت ممنون ہوں گا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی اور میری بات ہوئی تھی۔ کہ آپ سے کہا جائے کہ آپ بجائے حسرت موہانی کے مولوی عبدالحق پر لکھیں لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا ہے گستاخی معاف! کیا اب بھی یہ ممکن ہے؟

بہرحال لکھا ہوا مضمون بھیج کر ممنون فرمائیے۔

نیازمند

بشیر احمد

اس عرصے میں اپنا مضمون مکمل کر کے میں نے میاں صاحب کو بھیج دیا تھا۔ میاں صاحب غالباً چند روز کے لئے کراچی گئے ہوئے تھے۔ واپس آکر انہوں نے میرا مضمون پڑھا، اور اس کو پڑھ کر خوش ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا اظہار اپنے ایک خط میں اس طرح کیا:۔

المنظر

۳۲۔ لارنس روڈ، لاہور

۷/ دسمبر ۵۷ء

مشفقی و محترمی عبادت صاحب، تسلیم

آپ کے مضمون مولانا حسرت موہانی کی رسید تو بھیج چکا ہوں۔ اور دبی زبان میں اس کی طوالت کی شکایت بھی کر چکا ہوں۔

لیکن آج اُسے پڑھ کر اپنی شکایت کو واپس لینے کے لئے یہ خط لکھ رہا ہوں۔

واہ وا! کیا خوب مضمون لکھا ہے آپ نے! لُطف آگیا یہ مضمون تاریخی بھی ہے، ادبی بھی، سیاسی بھی!

مکرر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آپ کا نیازمند

بشیر احمد

مجھے میاں صاحب کے اس خط سے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ انہوں نے میرے

130282

Marfat.com

مضمون کو پسند فرمایا، اور اس کو بہ یک وقت تاریخی، ادبی اور سیاسی نوعیت کا مضمون قرار دیا۔ اور اس کو ہمایوں کے سالنامے ۵۸ء میں نہایت اہتمام سے شائع کر دیا۔

یہ مضمون خود مجھے بھی پسند تھا۔ اس لئے کہ اس میں مولانا حسرت موہانی کی دلکش رنگا رنگ اور پہلو دار شخصیت کے کچھ نقوش اُبھر کر سامنے آتے تھے۔ شاید اسی لئے ہمایوں میں شائع ہونے کے بعد کئی رسالوں نے اس کو نقل کیا، اور اب یہ میری کتاب "رہ نوردانِ شوق" میں شامل ہے۔

میاں شبیر احمد بڑے ہی سادہ، مخلص، دیانت دار، سچے اور وضع دار بزرگ تھے۔ میں نے اُن کے یہ خط صرف اسی خیال سے نقل کئے ہیں کہ اُن سے اُن کی شخصیت کے کئی پہلو آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ وہ سچے اور مخلص آدمی تھے۔ اُن کا مزاج علمی ادبی تھا۔ اُن میں کام کرنے کی لگن تھی۔ وہ دُھن کے پکے تھے۔ اُن میں اپنی بڑائی کا احساس نام کو بھی نہیں تھا۔ وہ لکھنے پڑھنے والوں کی عزّت کرتے تھے۔ جو چیز پسند آئے اس کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ برخلاف اس کے دل کھول کر اُس کی داد دیتے تھے۔

میاں صاحب کا تعلق لاہور کے ایک متمول مسلمان خاندان سے تھا۔ اُن کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ لیکن اپنے دولت مند ہونے کا انہیں بالکل احساس نہیں تھا۔ وہ سادگی سے رہتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اُن کے مزاج میں ایک طرح کی درویشی تھی۔ رعونت جو دولت مند لوگوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے، اور تکبّر جو اس قسم کے لوگوں میں کسی نہ کسی حد تک ضرور نمایاں ہوتا ہے، میاں صاحب اُس سے کوسوں دور تھے۔

وہ بڑی سادگی اور بے تکلفی سے مہینے میں ایک دو دفعہ ضرور اورینٹل کالج میں آجاتے تھے۔ مقصد صرف خیریت معلوم کرنا یا علمی ادبی معاملات میں کوئی مشورہ کرنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ٹیلی فون بھی اکثر کرتے تھے، اور بہت سے مسائل ٹیلی فون ہی پر طے کر لیتے تھے۔ اورینٹل کالج اس زمانے میں ایک ادبی مرکز بن گیا تھا۔ اکثر ادبی محفلیں ہوتی رہتی تھیں۔ میاں صاحب ان محفلوں میں ہمیشہ باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے، جب بھی انہیں دعوت دی گئی وہ نہایت خندہ پیشانی سے تشریف لائے کبھی مصروفیت کا عذر نہیں کیا۔ بلکہ بعض اوقات تو کام چھوڑ کر تشریف لاتے تھے۔ اس لئے کہ علمی ادبی ماحول سے اُنہیں گہری دلچسپی تھی، اور وہ اورینٹل کالج کی ان محفلوں میں شریک

Marfat.com

ہوکر خوش ہوتے تھے۔

میاں صاحب کا ادبی ذوق نہایت شُستہ اور پختہ تھا اُنہوں نے ادبیات کا مطالعہ بڑے ذوق وشوق سے کیا تھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت مطالعے میں صَرف کرتے تھے، اور نہ صرف ادبیات بلکہ دوسرے موضوعات پر بھی معیاری کتابیں اور رسالے پڑھتے رہتے تھے، اور جب بھی اُن سے گفتگو ہوتی تھی وہ ادب، سیاست اور قومی وملّی مسائل پر بڑے ہی متوازن انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ کسی کے خلاف کچھ کہنا، اور کسی کے خلاف لکھنا، اور کسی کی دلآزاری کرنا یا کسی کو کم مرتبہ سمجھنا، اُن کے نزدیک گناہ کبیرہ تھا۔ وہ محبت کے آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا اس دُنیا میں کوئی دشمن نہیں تھا۔

اُن کی صحت کبھی اچھی نہیں رہی۔ کمزور سے آدمی تھے۔ اس لئے کھانے پینے میں خاص طور پر بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ اس معاملے میں کچھ وہم بھی اُن کے مزاج میں تھا۔

میاں صاحب چائے نہیں پیتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ نقصان دہ چیز ہے۔ اس سے بلڈ پریشر کا مرض ہوجاتا ہے۔ لیکن چائے کی محفلوں میں شریک ضرور ہوتے تھے، اور مجلسی آداب کی اس حد تک پابندی کرتے تھے کہ چائے کی جگہ پیالی میں صرف گرم پانی ڈال کر پیتے تھے۔

ایک دن اورینٹل کالج کی کسی تقریب میں تشریف لائے۔ جب محفل اختتام کو پہنچی، اور چائے کا دور شروع ہوا تو سب حاضرین کے ساتھ اس میں شریک ہوئے، لیکن چپکے سے میرے کان میں کہا "عبادت صاحب! میرے لئے ایک پیالی گرم پانی منگوا لیجئے"۔

میں نے کہا "دودھ کی پیالی منگوا دیتا ہوں"۔

کہنے لگے "نہیں، صرف گرم پانی ایک چائے کی پیالی میں منگوا دیجئے"۔

میں نے چپراسی سے کہا "ایک پیالی گرم پانی لے آؤ"۔ گرم پانی تیار تھا۔ وہ گرم پانی کی ایک پیالی لے آیا۔ میاں صاحب بڑے شوق سے وہ گرم پانی پی کر، چائے پینے والوں کا ساتھ دیتے رہے، اور دلچسپ باتیں کرتے رہے۔

میں اس منظر کو کبھی بھولتا نہیں۔ جب بھی یاد آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ کس بلا کی تہذیب اور شائستگی تھی اس عجیب وغریب شخص میں!

Marfat.com

وضع داری اور آداب محفل کی پابندی میاں صاحب پر ختم تھی۔

وہ محفلوں میں ہمیشہ پورا سوٹ زیب تن کر کے تشریف لاتے تھے۔ گرمیوں میں بھی اس کا خاص اہتمام ہوتا تھا۔ گھر پر بھی جب کوئی ملنے آتا تو میاں صاحب پورے سوٹ میں ملبوس ہو کر باہر تشریف لاتے تھے۔

ایک دن کہ سخت گرمی کا موسم تھا میں کسی کام سے اُن سے ملنے کے لئے المنظر گیا۔ اطلاع کروائی۔ چند منٹ میں میاں صاحب سوٹ میں ملبوس باہر تشریف لے آئے۔

میں نے اُس دن اُن سے کہا "ہم لوگوں نے تو گرمیوں میں سوٹ پہننا چھوڑ دیا ہے گرمی بہت لگتی ہے۔ آپ کی وضع داری کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے اپنی وضع نہیں چھوڑی۔

میاں صاحب کہنے لگے "عبادت صاحب! بات وضع داری اور عادت کی ہے۔ سوٹ پہنے بغیر میں باہر نہیں نکل سکتا۔ کسی سے مل نہیں سکتا۔ باتیں نہیں کر سکتا اگر سوٹ پہنے بغیر باہر نکلوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں برہنہ ہوں۔ عادت کی بات ہے۔ اب اس کی عادت سی ہو گئی ہے"۔

میں نے کہا "میاں صاحب! یہ بہت اچھی عادت ہے۔ میں تو جب بھی آپ کو اس لباس میں دیکھتا ہوں، میرا جی خوش ہو جاتا ہے"۔

دراصل بات یہ ہے کہ میاں صاحب کی زندگی انگریزوں کے ماحول میں گذری تھی خاصا وقت انہوں نے انگلستان میں بھی گذارا تھا۔ اس لئے وضع قطع میں انگریزوں کی سی باقاعدگی اُن کے مزاج کا جُز بن گئی تھی۔ وہ مغرب کے انداز میں زندگی بسر کرتے تھے۔ البتہ خاص طرح کی خاندانی روایات نے اُن کے مزاج کو مشرقی بنا دیا تھا، اور وہ اُن تمام آداب کی سختی سے پابندی کرتے تھے جو مشرقی تہذیب کا طرۂ امتیاز ہیں۔

میاں صاحب کو میں نے صرف ایک دفعہ بغیر سوٹ کے دیکھا۔ یہ وہ دن تھا جس دن سید امتیاز علی تاج صاحب کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ ہم لوگ اُن کے گھر ایبٹ روڈ پر جمع تھے۔ سب لوگ سوگوار تھے۔ بیشتر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سانحہ ہی کچھ ایسا تھا کہ ضبط کرنا مشکل تھا۔

Marfat.com

تھوڑی دیر میں دیکھا کہ میاں صاحب کسی شخص کے سہارے تشریف لا رہے ہیں۔ آج سوٹ کی جگہ پاجامے، قمیص اور کوٹ میں ملبوس تھے۔ ان کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے ان پر فالج کا اثر تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ تعزیت کے لئے تشریف لائے۔ آج میں نے پہلی اور آخری بار انہیں سوٹ اور ٹائی کے بغیر دیکھا۔ خاصی دیر تک وہ ہم لوگوں سے سیّد امتیاز علی تاج مرحوم کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس المناک سانحے کا انہیں بھی بڑا غم تھا۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو چھلکے پڑتے تھے۔

فالج کی ایسی بیماری کے باوجود اُن کی وضع داری ہی انہیں یہاں کھینچ لائی تھی، اُن کے خلوص اور محبت ہی نے انہیں اس بیماری کے عالم میں بھی یہاں آنے کے لئے مجبور کیا تھا۔

اس المناک سانحے کے تھوڑے ہی عرصے بعد میاں صاحب بھی اس دُنیا سے رُخصت ہوگئے اور یہ خصوصیات بھی اُن کے ساتھ ہی چلی گئیں۔

میں انہیں یاد کرتا ہوں اور جب بھی اُن کی یاد آتی ہے میر صاحب کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے

ولے لوگ اب اِلٰہی کس دیس جا بسے ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

Marfat.com

ابوالاثر حفیظ جالندھری

شاعرِ پاکستان حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری ایک شگفتہ و شاداب انسان اور ایک نامور شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی شگفتگی و شادابی سے ایک زمانے تک احباب کی محفلوں کو زعفراں زار بنایا اور اپنی شاعری سے جو گل و گلزار کھلائے وہ ہمیشہ ہمیشہ اُردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے دلوں کو لُبھاتے رہیں گے، اور اُن کے احساس جمال میں مسرتوں کی تھرتھراہٹ اور ارتعاش سے رنگ و نور کی ایک دُنیا پیدا کرتے رہیں گے۔

حفیظ صاحب کی شاعری کا شباب میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ اُس زمانے میں اُن کی جو نظم بھی شائع ہوتی تھی، میں اس کو بار بار پڑھتا تھا، یہاں تک کہ وہ مجھے ازبر ہو جاتی تھی، میں تنہائی کے لمحوں میں اس سے لُطف اندوز ہوتا تھا، اور احباب کی محفلوں میں انہیں کے مخصوص انداز کے ساتھ پڑھ کر حُسن و جمال، رنگ و نور اور نغمگی و موسیقیت کی فضا پیدا کرتا تھا۔ میرے احبابِ خاص اس فضا میں گم ہو جاتے تھے، اور حفیظ کو دل کھول کر داد دیتے تھے۔

اس زمانے میں حفیظ صاحب کے ہم عصروں میں حضرت جوش ملیح آبادی، جگر صاحب، فیض صاحب، فراق صاحب، احسان دانش، ساغر نظامی، روش صدیقی، مجاز، جذبی اور جاں نثار اختر وغیرہ نے جدید اُردو شاعری کو آسمانوں کی بلندیوں سے ہم کنار کر دیا تھا۔ اِن میں سے بیشتر شعراء مشاعروں میں اپنی غزلیں اور نظمیں اپنے اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ ان میں حفیظ کا ترنم سے پڑھنے کا انداز بھی منفرد حیثیت رکھتا تھا۔ لوگ بڑے ذوق و شوق سے اُن کا کلام سنتے تھے،

Marfat.com

اور بار بار پڑھنے کی فرمائش کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ حفیظ صاحب مشاعروں پر چھا جاتے تھے، اور بلا مبالغہ کئی کئی گھنٹے اپنا کلام سُناتے تھے۔ لوگوں کے جذب و شوق کا یہ عالم ہوتا تھا کہ وہ مسحور ہو جاتے تھے اور اپنی جگہ سے اس طرح چپکے ہوئے بیٹھے رہتے تھے کہ پہلو بدلنے تک کے لئے جنبش نہیں کرتے تھے۔

میری طالب علمی کے زمانے میں اسلامیہ کالج لکھنؤ میں ہر سال بڑے پیمانے پر ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ہم لوگ اس مشاعرے کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ کیونکہ اس مشاعرے میں اس زمانے کے تقریباً تمام شاعروں کو دعوت دی جاتی تھی، اور وہ اس مشاعرے میں شرکت کے لئے لکھنؤ ضرور آتے تھے۔ میں نے جوش صاحب، جگر صاحب، فراق صاحب، حفیظ صاحب، فیض صاحب، احسان دانش صاحب، ساغر نظامی صاحب، روش صدیقی صاحب، جاں نثار اختر، مجاز، جذبی، اور مسعود اختر جمال وغیرہ کو انہیں مشاعروں میں سنا تھا۔

حفیظ صاحب اس زمانے میں ان تمام شاعروں میں اس اعتبار سے منفرد تھے کہ ان مشاعروں میں ان سے بار بار اور سب سے زیادہ کلام سُنانے کی فرمائش کی جاتی تھی اور بلا مبالغہ کئی کئی گھنٹے وہ اپنا کلام دلنشیں و دلآویز ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ رات گئے اُن کی باری آتی تھی، وہ ایک دو غزلیں سُناتے تھے۔ پھر حاضرین فرمائش کرتے تھے کہ جاگ سوز عشق جاگ، ابھی تو میں جوان ہوں، یا قاصہ پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائیے۔ اور آخر میں ہر طرف سے یہ فرمائش ہوتی تھی کہ کچھ حصے شاہنامہ اسلام، کے بھی عنایت کیجیے۔ ایک مشاعرے میں تو وہ دو ڈھائی گھنٹے تک شاہنامہ سناتے رہے اور سامعین سے داد وصول کرتے رہے۔ تمام حاضرین پر مسحور کن کیفیت طاری رہی۔

اسی زمانے میں ایک نجی صحبت میں بھی مجھے اُن کے کلام کو سُننے کا اتفاق ہوا۔ یہ محفل کسی لکھنؤ کی اہم شخصیت کے مکان پر ہوئی۔ میں اس زمانے میں کالج کا طالب علم تھا۔ کسی دوست اور کلاس فیلو کے توسط سے مجھے بھی اس محفل میں شریک ہونے کا موقع مل گیا۔ کئی گھنٹے تک اُن کا کلام سُنا۔ بہت لطف آیا۔ محفل اختتام کو پہنچی تو اُن سے سرسری سی ملاقات کا موقع بھی ملا اور اس طرح اُن کی دلچسپ باتیں سُننے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

حفیظ صاحب سے یہ میری پہلی مُلاقات تھی!

Marfat.com

پھر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی، اور اس زمانے میں حکومت ہند نے انہیں سانگ پبلسٹی آفیسر کے عہدے پر فائز کر دیا۔ اس ادارے میں شوکت تھانوی صاحب، ان کے رفیق کار تھے۔ انہیں کے مکان پر انہوں نے اپنا ذیلی دفتر بھی قائم کر دیا تھا۔ مرکزی دفتر دلّی میں تھا، اور حفیظ صاحب اس زمانے میں مستقل طور پر دہلی ہی میں قیام پذیر تھے لیکن ہندوستان میں ہر جگہ دورے پر جاتے رہتے تھے لکھنو بھی اکثر اُن کا آنا جانا رہتا تھا۔ وہ شوکت تھانوی صاحب کے ہاں ٹھہرتے تھے، اور شوکت صاحب اُن کے اعزاز میں، منصبی مصروفیات کے ساتھ ساتھ حفیظ صاحب کے اعزاز میں ادبی محفلیں بھی منعقد کرتے تھے۔

شوکت صاحب میرے بزرگ بھی تھے اور دوست بھی۔ بزرگ اس لئے کہ میرے والد صاحب سے اُن کی دوستی تھی، لیکن ادبی حوالے سے وہ میرے دوست بھی تھے۔ بے تکلف تو وہ ہر ایک سے تھے۔ بذلہ سنجی اُن کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ فقرہ چست کرنے سے کبھی باز نہیں آتے تھے، مجھ سے بھی اُن کی تھوڑی سی بے تکلفی تھی۔ لیکن اکثر یہ کہتے تھے کہ "میں آپ سے زیادہ بے تکلف نہیں ہو سکتا، میری نظروں میں آپ برخوردار ہیں کیونکہ آپ کے والد صاحب سے میری دوستی اور بے تکلفی ہے"۔

میں شوکت صاحب کی باتیں سنتا رہتا تھا، لیکن اُن کے سامنے بولتا کم تھا۔ اُن کی بزرگی کا خیال مجھے ہمیشہ رہتا تھا۔ بہرحال اُن سے میری شناسائی تھی، اور میں اس شناسائی سے فائدہ اُٹھاتا تھا۔ اُن کے ہفتہ وار اخبار 'سرپنچ' میں کبھی کبھی میرے چھوٹے چھوٹے مضامین اور مختصر خاکے وغیرہ شائع ہو جاتے تھے۔ حفیظ صاحب سے ملنے اور مفصل ملاقات کرنے کی آرزو بھی شوکت صاحب کے توسط سے پوری ہوئی۔

لکھنؤ کے دوران قیام میں ایک دن انہوں نے حفیظ صاحب سے میری مُلاقات کے لئے باقاعدہ وقت مقرر کیا۔ میں مقررہ وقت پر اُن کے ہاں پہنچا۔ حفیظ صاحب چند منٹ میں اپنے کمرے سے باہر تشریف لائے، اور بڑی محبت سے ملے۔ معانقہ کیا، اور مجھ سے خاصی دیر تک دلچسپ باتیں کیں۔

کہنے لگے "آپ کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ آپ تو ماشاءاللہ نوجوان ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آپ

Marfat.com

پختہ عمر کے آدمی ہوں گے۔ خدا جانے آپ کی یہ تصویر میرے ذہن میں کیوں محفوظ ہوئی۔ ہو سکتا ہے آپ کے تنقیدی مضامین اس کا سبب ہوں۔ اِن مضامین میں تو آپ پختہ عمر کے باشعور آدمی معلوم ہوتے ہیں"۔

میں نے کہا "میں تو ابھی یونیورسٹی کا طالب علم ہوں۔ ادب و شعر میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اُردو میں ام۔ اے کر رہا ہوں۔ آپ کی شاعری کا پرستار ہوں۔ آپ کی بہت سی نظمیں مجھے زبانی یاد ہیں۔ آپ سے ملنے کی خواہش تھی۔ آج شوکت صاحب کے توسط سے یہ دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ میں آپ کا اور شوکت صاحب کا شکر گذار ہوں کہ آپ حضرات نے مجھے یہ موقع فراہم کیا"۔

حفیظ صاحب کہنے لگے "میں نے جدید شاعری پر آپ کے کچھ مضامین پڑھے ہیں۔ ان میں آپ نے میرا ذکر بھی اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ اس طرح آپ سے غائبانہ ملاقات تھی۔ آج آپ سے مِلنے کا بھی موقع مِلا۔ بہت خوشی ہوئی"۔

میں نے کہا "آپ کی نوازش ہے کہ آپ نے میرے لئے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکالا۔ میں تو آپ کی شاعری کا دلدادہ ہوں۔ آپ سے ملنے، باتیں کرنے اور کلام سننے کو بہت جی چاہتا تھا۔ لکھنؤ کے مشاعروں میں میں نے کئی کئی گھنٹے آپ کا کلام سُنا ہے۔ آپ تو اپنے کلام اور ترنم سے لوگوں کو مسحور کر دیتے ہیں۔ مسحور ہونے والوں میں ایک میں بھی ہوں"۔

حفیظ صاحب ان باتوں کے بعد تھوڑی دیر میں بے تکلف ہو گئے، اور کچھ لطیفے سنانے لگے۔ اپنے ہم عصروں کی باتیں بھی اُنہوں نے شگفتگی کے ساتھ کیں، اپنی شاعری کا ذکر بھی اُنہوں نے بذلہ سنجی کے ساتھ کیا۔ اپنے بعض بے تکلف دوستوں کا ذکر بھی اُنہوں نے دل موہ لینے والے انداز میں شگفتگی کے ساتھ کیا۔

اور میں اُن کی یہ باتیں چُپ چاپ سنتا رہا، اور اُن کے بے تکلف انداز گفتگو سے محظوظ ہوتا رہا۔ خود اُن کے ساتھ احترام کے خیال سے بے تکلف نہ ہو سکا۔ شوکت صاحب البتہ گفتگو میں شریک رہے، اور اپنی بذلہ سنجی سے پھلجڑیاں سی چھوڑتے رہے۔ مجھے اِن دونوں کی دلچسپ گفتگو نے بہت لطف دیا۔

اس زمانے میں ایسی کئی ملاقاتیں حفیظ صاحب سے ہوئیں، اور اس طرح مجھے ان کو بہت

Marfat.com

قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اُن کی شخصیت کے کئی دلچسپ پہلو آنکھوں کے سامنے آئے، اور اُن سے تھوڑی سی قُربت بھی حاصل ہوگئی۔

ایک ملاقات میں بات کبابوں پر چل نکلی۔ دیر تک ہم لوگ شامی کباب، چپلی کباب اور سیخ کے کبابوں کی باتیں کرتے رہے۔ شوکت صاحب نے حفیظ صاحب کی موجودگی میں مجھ سے پوچھا "آپ نے لکھنؤ کے ٹنڈے کبابی کی دوکان دیکھی ہے اور اس کے ہاں کباب کھائے ہیں"؛

میں نے کہا "جی ہاں! کئی بار اس کے ہاں گیا ہوں۔ اس کی دوکان پر جاکر کباب بھی کھائے ہیں۔ اس کے ہاتھ میں تو جادو ہے۔ بہت لذیذ کباب بناتا ہے لیکن ان کبابوں کا مزہ اس کی دوکان ہی پر بیٹھ کر کھانے میں ہے۔ گرم گرم کباب بناکر بھیجتا جائے اور آپ کھاتے جائیں"۔

شوکت صاحب نے کہا "اچھا کبابی تو خیر وہ ہے ہی، لیکن حاضر جواب اور فقرے باز بھی وہ بلا کا ہے"۔

میں نے کہا "مجھے اس کا تجربہ نہیں ہوا۔ میں تو اپنے بعض ساتھیوں کے ساتھ کبھی کبھی اس کے ہاں کباب کھانے جاتا ہوں۔ اس سے بات نہیں کرتا۔ کیونکہ سنا ہے کہ وہ بہت جلد بے تکلف ہو جاتا ہے"۔

پھر انہوں نے ایک واقعہ سنایا۔

کہنے لگے "چند روز ہوئے میں حفیظ صاحب کو لے کر اس کی دوکان پر کباب کھانے کے لئے گیا تھا۔ اس کی دوکان پر پہنچے تو دیکھا مجمع بہت ہے۔ اندر بھی لوگ بیٹھے ہوئے کباب کھا رہے ہیں اور باہر بھی کچھ لوگوں کا ہجوم ہے۔ وہ بے نیازی کے ساتھ کباب بنانے میں مصروف رہا۔ ہم لوگوں کو دیکھا تو اُس نے کہا "میاں! چند منٹ کی آپ کو زحمت ہوگی۔ اندر جو لوگ بیٹھے ہیں وہ چلے جائیں گے۔ پھر آپ اندر تشریف رکھیئے گا۔ آپ کے لئے خاص طور پر کباب تیار کر کے پیش کروں گا"۔

شوکت صاحب نے بتایا کہ میں نے اس موقع پر حفیظ صاحب کا تعارف کروانا مناسب سمجھا اور کہا کہ "میاں! اس وقت تو تمہارے ہاں میرے ساتھ ہندوستان کے مشہور شاعر حضرت ابوالاثر حفیظ جالندھری تشریف لائے ہیں۔ میں خاص طور پر انہیں یہاں لایا ہوں۔ اندر بیٹھنے کی

Marfat.com

ضرورت نہیں۔ ہم لوگ یہیں کھڑے کھڑے کباب کھالیں گے۔"

یہ بات سُن کر اس نے ہم دونوں کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، اوپر سے نیچے تک کئی بار نگاہ ڈالی، اور صرف اتنا کہا "اماں نہیں"۔

حفیظ صاحب اور میں نے اُس کے اِس فقرے سے بہت لُطف لیا۔ دراصل وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ اتنے بڑے شاعر اور مزاح نگار کا دوکان کے سامنے سڑک پر کھڑے ہو کر کھانا معیوب ہے۔ یہ تہذیب کے خلاف ہے۔ ہمارے اوپر تو اس فقرے کو سُن کر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ بڑا ہی ذہین اور وضع دار آدمی ہے"۔

میں نے کہا "یہ لوگ بڑے ہی حاضر جواب ہوتے ہیں۔ فقرہ چُست کرنے میں ان کا جواب نہیں۔ کچھ نہ کہنے پر بھی نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ جاتے ہیں"۔

غرض لکھنؤ میں شوکت تھانوی صاحب کے توسّط سے حفیظ صاحب کے ساتھ کئی دلچسپ مُلاقاتیں ہوئیں۔ اِن ملاقاتوں میں مجھے اُن کی دلکش شخصیت کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کا موقع ملا۔

لکھنؤ یونیورسٹی سے اُردو میں ام۔ اے پاس کر کے میں اینگلو عربک کالج دہلی میں اُردو کا اُستاد ہو گیا۔ حفیظ صاحب کا صدر دفتر اس زمانے میں دِلّی میں تھا، اور وہ مستقل طور پر دلّی ہی میں رہتے تھے۔ یہاں اُن سے کئی بار مِلنے کا موقع مِلا۔ میں کبھی اُن کے گھر نہیں گیا۔ یہ مُلاقاتیں کسی نہ کسی ادبی محفل میں ہو جاتی تھیں۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ادیب اور شاعر دلّی میں بہ سلسلۂ ملازمت جمع ہو گئے تھے۔ ان میں حفیظ صاحب، پطرس بخاری، پروفیسر حمید احمد خاں، پروفیسر وقار عظیم، مولانا حامد علی خاں، ڈاکٹر تاثیر صاحب، فیض صاحب، راشد، میراجی، مختار صدیقی، کرشن چندر، حیات اللہ انصاری وغیرہ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ یہ لوگ کبھی کبھی مِل بیٹھتے تھے، اور ادبی باتیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی لکھنے والا اپنا مضمون یا افسانہ بھی پڑھ دیتا تھا۔ پھر اس پر تنقیدی گفتگو ہوتی تھی۔ میں بھی کبھی کبھی اِن محفلوں میں چلا جاتا تھا، اور اس طرح مجلسوں سے قبل یا اُس کے بعد ان بزرگوں اور دوستوں سے ملاقاتیں ہو جاتی تھیں۔ اسی مقصد سے میں اِن محفلوں میں اکثر شریک ہو جاتا تھا۔ اس سلسلے کی ایک

Marfat.com

محفل مجھے نہیں بھولتی۔

یہ محفل کشمیری دروازے کے باہر پولی ٹکنیک کی عمارت میں ہوئی۔ اس میں بڑے بڑے ادیب اور نقاد شریک تھے۔ میں بھی پیچھے کی نشستوں پر جا کے بیٹھ گیا۔ ایک صاحب نے اس محفل میں راشد کی شاعری پر ایک مفصل تنقیدی مضمون پڑھا۔ مضمون بہت اچھا تھا، اور بڑی محنت اور بصیرت سے لکھا گیا تھا۔ اُنہوں نے مضمون ختم کیا تو تنقیدی بحث شروع ہوئی۔ بزرگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ لیکن حفیظ صاحب اور تاثیر صاحب نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کچھ ایسی باتیں کہیں جس سے محفل تو زعفران زار ہو گئی لیکن صاحب مضمون ناراض ہو گئے، اور انہوں نے سنجیدہ محفل میں ان مزاحیہ فقروں کے خلاف احتجاج کیا۔ کشیدگی کی فضا پیدا ہو گئی۔ لیکن حفیظ صاحب نے اس کو محسوس نہیں کیا۔ بلکہ وہ برابر ہنستے رہے۔ اس میں ان کی بڑائی تھی۔ وہ اس زمانے میں ناراض بہت کم ہوتے تھے۔

محفل ختم ہوئی تو میں نے حفیظ صاحب سے کہا "میں تو حیران ہوں کہ آپ نے صاحب مضمون کے بگڑ جانے کو محسوس نہیں کیا، اور ہنستے اور مسکراتے رہے"۔

کہنے لگے "یار! جب تک محفل میں فقرے نہ کسے جائیں مزہ نہیں آتا۔ سنجیدہ فضا میں کوئی بات تو ایسی ہونی چاہیئے جس سے محفل میں شگفتگی پیدا ہو۔ لوگوں کو اس فضا کی وجہ سے ناراض نہیں ہونا چاہیئے کوئی ناراض ہو جائے یا بُرا مان جائے تو میں اس کو منانے کی کوشش کرتا ہوں۔ خود کبھی بُرا نہیں مانتا۔ فقرہ کسنے والے کو خود کبھی ناراض نہیں ہونا چاہیئے۔ اسی میں اس کی بڑائی ہے"۔

میں نے کہا "میں آپ کو داد دیتا ہوں کہ آپ نے صاحب مضمون کے ناراض ہونے، اور اُن کے بُرا بھلا کہنے کو محسوس نہیں کیا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو کشیدگی کی فضا ناقابل برداشت ہو جاتی۔ آپ نے اپنے رویئے سے بدمزگی کو ختم کر دیا۔ میں نے زندگی میں ایسے لوگ ذرا کم ہی دیکھے ہیں"۔

کہنے لگے "یار! میرے اندر قوت برداشت بہت ہے۔ فقرہ چُست کرنا میرا مزاج ہے۔ اس کے نتائج اور اثرات مابعد کو برداشت کرنے کے لئے بھی میں ہمیشہ تیار رہتا ہوں"۔

میں نے کہا "حفیظ صاحب آپ کی شاعری کی طرح آپ کی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی بھی محفلوں کو

Marfat.com

زعفراں زار بنا دیتی ہے۔ لطف آجاتا ہے۔

حفیظ صاحب میری یہ باتیں سن کر خوش ہوتے، اور دیر تک ہم لوگوں کو اپنے دلچسپ فقروں سے ہنساتے رہے۔

آج بھی میں اُن کی ان باتوں کو یاد کر کے لطف اندوز ہوتا ہوں۔

دِلّی کے دوران قیام میں کئی بار میں نے انہیں اینگلو عربک کالج کی ادبی محفلوں اور مشاعروں میں مدعو کیا، اور وہ بغیر کسی تکلّف کے ان جلسوں اور مشاعروں میں تشریف لائے۔ دوسرے شاعروں کی طرح کبھی کوئی معاوضہ ہم سے طلب نہیں کیا۔ کئی کئی گھنٹے اپنا کلام سُنایا۔ اساتذہ اور طلباء سے دلچسپ باتیں کیں اور اپنی مخصوص بذلہ سنجی سے کالج کی متعدد محفلوں کو زعفراں زار بنایا۔

اینگلو عربک کالج اُس زمانے میں ایک تدریسی ادارہ ہی نہیں تھا، ایک ادبی مرکز بھی بن گیا تھا۔ آئے دن کالج میں ادبی جلسے، سیمینار، مذاکرے اور مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ حفیظ صاحب میری درخواست پر ہمیشہ ان میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے، اور ان کے شریک ہونے سے ہماری حوصلہ افزائی کا سامان پیدا ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں اُن کی منصبی مصروفیات بے شمار تھیں، اور اُن کے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا تھا۔ اکثر وہ دورے پر جاتے رہتے تھے، لیکن میں نے جب بھی انہیں کالج میں آنے کی دعوت دی، وہ نہایت خندہ پیشانی سے تشریف لائے۔ اکثر تو ایسا ہوا کہ کالج کی تقریبات میں شریک ہونے کے لئے انہوں نے اپنے دورے تک کو مُلتوی کر دیا۔

بات یہ ہے کہ حفیظ صاحب ادبی آدمی تھے، ادبی محفلوں میں شریک ہو کر انہیں ہمیشہ مسرت ہوتی تھی، اور پھر وہ طالب علموں پر شفقت بھی فرماتے تھے۔ کچھ میرے ذاتی تعلقات کا بھی لحاظ تھا۔ اس لئے بے تکلفی سے کالج میں آجاتے تھے۔ بہر حال اُن کی صحبت میں ہم سب بہت اچھا وقت گذارتے تھے۔

چند سال کے بعد دوسری جنگ عظیم ختم ہو گئی۔ حفیظ صاحب حکومت ہند کی ملازمت سے سبک دوش ہو گئے۔ اسی عرصے میں پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ حفیظ صاحب لاہور واپس چلے گئے۔ میں بھی دِلّی میں لُٹ پٹ کر، اور کسی طرح موت کے منہ سے نکل کر لاہور پہنچ گیا۔ میں نے اورینٹل کالج میں ویسی ہی محفل جمالی جیسی کہ دِلّی کے اینگلو عربک کالج میں قیام پاکستان سے قبل جمی ہوئی تھی۔

Marfat.com

حفیظ صاحب اکثر لاہور میں بھی مجھے نوازتے تھے۔کبھی کبھی کالج میں بے تکلفی سے تشریف لے آتے تھے، اور دیر تک اپنی دلچسپ صحبتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتے تھے۔

اس زمانے میں اورنٹیل کالج بھی عربک کالج دہلی کی طرح ایک اچھا خاصا ادبی مرکز بن گیا تھا۔ ادبی جلسے اور مشاعرے یہاں بڑے اہتمام سے ترتیب دیئے جاتے تھے۔اس زمانے میں میں نے ادبی تقریبات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس میں نامور شاعر اور ادیب اپنے حالات اور شخصیت کے بارے میں خود اظہار خیال کرتے تھے، اور آخر میں اپنا کلام سُناتے تھے۔ان تقریبات میں جوش صاحب، جگر صاحب، فراق صاحب، صوفی تبسم صاحب، احسان دانش صاحب، سیّد عابد علی عابد صاحب، فیض صاحب، ن۔م۔راشد، مختار صدیقی، قیوم نظر، یوسف ظفر، سید محمد جعفری، حفیظ ہوشیارپوری، ناصر کاظمی اور حبیب جالب وغیرہ شریک ہوتے۔ان کے ساتھ ہم لوگوں نے الگ الگ شامیں منائیں۔حفیظ صاحب بھی اِن تقریبات میں شریک ہوئے اور ایک شام اُن کے لئے بھی وقف کی گئی، جس میں انہوں نے کئی گھنٹے تک اپنے حالات بیان کئے، اپنی شخصیت کے کئی دلچسپ پہلوؤں کو واضح کیا، اور تاریخی ترتیب سے اپنا کلام سنایا۔اس زمانے میں ریکارڈنگ کا معقول انتظام نہیں تھا، اس لئے اُن کی دلچسپ باتیں ریکارڈ نہ ہوسکیں۔البتہ اُن کے ساتھ جو متعدد گروپ فوٹو بنوائے گئے، وہ آج بھی اُن کی یادگار کے طور پر میرے پاس محفوظ ہیں۔

لاہور کے دوران قیام میں حفیظ صاحب میری دعوت پر کئی بار میرے غریب خانے پر بھی تشریف لائے۔اُنہوں نے کبھی انکار نہیں کیا۔کبھی کسی مصروفیت کی وجہ سے معذرت نہیں کی۔اُن کو صرف فون کر دینا کافی ہوتا تھا۔جب بھی باہر سے کوئی اہل علم یا شاعر لاہور آتا، میں اس کے اعزاز میں محفل منعقد کرتا۔حفیظ صاحب کو فون کرتا تو وہ ہمیشہ نہایت خندہ پیشانی سے کہتے "یار! میں ضرور آؤں گا۔اہل علم سے ملاقاتیں ہوں گی۔آپ کسی کو میرے ہاں بھیج دیجئے گا، میں اس کے ساتھ حاضر ہو جاؤں گا"۔

چنانچہ وہ کئی بار نیو کیمپس اور سمن آباد میں میرے غریب خانے پر تشریف لائے، کئی کئی گھنٹے میرے پاس بیٹھے۔مجھ سے اور حاضرین سے نہایت دلچسپ باتیں کیں۔یگانگت اور بے تکلفی کا ماحول پیدا کیا، اور اپنے کلام سے حاضرین کے دل موہ لئے۔وہ دوستوں کے دوست تھے، اور دوستی کو ہمیشہ

Marfat.com

نباہتے تھے۔ دوستوں کی خاطر تکلیف اُٹھانا بھی اُنہیں گوارا تھا۔ تقریباً اسّی سال کی عمر میں اُن کا اس طرح دوستوں کی خاطر کئی کئی گھنٹے بیٹھنا آسان کام نہیں تھا۔ اس عمر میں انسان آرام کرنا چاہتا ہے، گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔ حفیظ صاحب کبھی گوشہ نشین نہیں ہوئے۔ خاص طور پر دوستوں کا دل رکھنے کے لئے وہ اپنے اوپر خاصا جبر کرتے تھے۔ ہمت بھی ان میں بہت تھی۔ قوت ارادی سے کام لینا بھی انہیں خوب آتا تھا۔

حفیظ صاحب نے ساری زندگی شاعری کی، اور شاعری کی مختلف اصناف میں ایسے ایسے تجربے کئے جو ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ انہوں نے روایت کی پاس داری کے ساتھ جدید شاعری کی عمارت کو آسمانوں سے ہم کنار کر دیا۔ انہوں نے نئے انداز کی غزلیں تخلیق کیں، نظم نگاری میں نیا رنگ و آہنگ پیدا کیا۔ گیت لکھے جن سے اُردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ ایک طویل رزمیہ نظم شاہ نامۂ اسلام لکھی جو اُردو میں اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے، اور جس کی بدولت انہیں فردوسیٔ اسلام کے نام سے یاد کیا گیا۔ اُن کی شاعری کی عمر ساٹھ ستّر سال سے کم نہیں ہے۔ اس زمانے میں وہ اُردو شاعری کے اُفق پر آفتاب اور ماہتاب بن کر چھائے رہے، اور اُن کی شاعری اور شخصیت کی گرمی اور روشنی سے بے شمار لوگوں نے کسب نور کیا۔

اُن کا ایک بہت بڑا کارنامہ پاکستان کے قومی ترانے کی تخلیق ہے۔ کیسے خوبصورت خیالات ہیں! کیا خوبصورت اشعار ہیں! کس درجہ حسین و دلآویز الفاظ ہیں! جب بھی یہ ترانہ پڑھا جاتا ہے، (اور انشاءاللہ رہتی دُنیا تک پڑھا جاتا رہے گا) تو اس کا ایک ایک لفظ دلوں میں اُتر جاتا ہے اور حواس پر سرخوشی بن کر چھا جاتا ہے۔ یہ ترانہ ابد تک زندہ رہے گا، اور اس کے خالق حفیظ صاحب بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ حفیظ صاحب کے دِل سے نکلی ہوئی آواز ہے۔ اس میں وطن دوستی کے جذبے اور شعورِ ملّی کے حسین ارتعاشات کی وہ تھرتھراہٹ ہے جو دلوں کو ایک عجیب سی مسرّت سے ہم کنار کر کے حواس کو تڑپاتی ہے، اور انسان کو خدا جانے کہاں کہاں پہنچا دیتی ہے۔ الفاظ اس کیفیت کو بیان کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

حفیظ صاحب سچے مسلمان اور کھرے پاکستانی تھے۔ ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں یہی دو رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہیں، اور یہی اُن کو زندۂ جاوید بنانے کے لئے کافی ہیں۔

Marfat.com

وہ صحیح معنوں میں شاعرِ اسلام اور شاعر پاکستان ہیں۔

شاعرِ اسلام اور شاعر پاکستان نے صرف شاعری ہی میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے والے کارنامے انجام نہیں دیئے، نثر میں بھی اپنا ایک مقام پیدا کیا ہے۔ اُن کے افسانے دلچسپ اور سبق آموز ہونے کے ساتھ ادبی نثر کے اچھے نمونے ہیں۔ اُن کے خطوط میں بھی بڑی دلکشی اور دلآویزی ہے۔ اور اُن کا چیونٹی نامہ تو ایک ایسی تخلیق ہے جس کو اُردو دنیا ہمیشہ یاد رکھے گی۔ چیونٹی نامہ لکھ کر انہوں نے ایک کارنامہ انجام دیا۔ وہ بجا طور پر اس کی تخلیق پر فخر کرتے تھے۔

جب چیونٹی نامہ، شائع ہوا تو انہوں نے اس کا ایک نسخہ ازراہ نوازش مجھے عنایت فرمایا۔ میں نے فوراً اس کی رسید بھیجی، اور اس پر تبصرہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے مجھے لکھا:۔

ماڈل ٹاؤن ۴۳-جی، لاہور

۷۳/۵/۸

میرے کرم فرما ڈاکٹر عبادت!

آپ کی یاد سے تو لفظ عبادت ہر زماں مُشرّف ہے۔ تاہم چیونٹی نامہ کی رسید میں آپ کا گرامی نامہ آج پھر میرے سامنے ہے جس میں اس کتاب کو اطمینان سے پڑھنے کے بعد، مفصل تبصرہ کرنے کا ارادہ آپ نے ظاہر کیا تھا۔ اچھا خاصہ عرصہ یہ چھوٹی سی کتاب (اگر آپ کی نظر و فکر سے اوجھل نہ ہو چکی ہو) آپ کے قلم سے تبصرے کی طالب ہے۔

میں نے اپنی زندگی میں اپنی کسی بھی تصنیف پر تبصرے کی کبھی خود درخواست نہیں کی۔

دعاگو

حفیظ جالندھری

Marfat.com

محترم جناب ڈاکٹر عبادت بریلوی، ام-اے-پی ایچ ڈی
پرنسپل اورینٹل کالج
(یونیورسٹی اولڈ کیمپس) لاہور

اِس خط کے ملنے کے بعد یہ کس طرح ممکن تھا کہ میں تبصرہ نہ لکھتا۔ میں نے تبصرہ لکھ کر حفیظ صاحب کو بھیج دیا، اور کہیں چھپ بھی گیا۔ حفیظ صاحب خوش ہوئے اور اِن کی خوشی سے مجھے بھی خوشی ہوئی۔

چند سال ہوئے حفیظ صاحب ماڈل ٹاؤن میں ہمارے اور ہم حفیظ صاحب کے پڑوسی ہو گئے۔ ہوا یوں کہ جی بلاک میں حفیظ صاحب کے مکان کے برابر اورینٹل کالج کے سابق پرنسپل پروفیسر محمد شفیع صاحب مرحوم اور اُن کے صاحب زادے ربانی صاحب کا ایک پلاٹ تھا جس کو میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر نزہت یار خاں نے خرید لیا، اور اس پر بہت بڑی دو منزلہ کوٹھی بنالی۔ حفیظ صاحب اس سے بہت خوش ہوئے۔ اُن کی بیگم خورشید حفیظ صاحبہ نے بھی جو میری عزیز شاگرد تھیں مسرت کا اظہار کیا، اور ایک اچھے ہمسائے کے تمام فرائض بڑی خوش اسلوبی سے پورے کئے ہمیشہ خیال رکھا۔ دونوں کئی بار یہ پوچھنے کے لئے تشریف لائے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ مکان کی تعمیر سے قبل خاص طور پر آکر یہ کہا کہ "جو پلاٹ آپ نے خریدا ہے اور جس پر کوٹھی تعمیر ہونے والی ہے، اس میں دو بہت پرانے کھجور کے درخت ہیں، اُن کو نہ کٹوائیے گا"۔ یہ میرے دل کی بات تھی۔ چنانچہ نقشہ اس طرح بنوایا گیا کہ وہ درخت محفوظ رہیں، وہ دو درخت آج تک محفوظ ہیں۔ میں نے اُن کا نام "اشجار حفیظ جالندھری" رکھ دیا ہے۔ کیونکہ حفیظ صاحب نے یہ کہا تھا کہ "برسوں سے میں ان اشجار کے حُسن سے محظوظ ہوتا رہا ہوں۔ اِن کی رسیلی کھجوریں بھی بہت کھائی ہیں اور ان کو روزانہ مختلف زاویوں سے بار بار دیکھا بھی ہے۔ ایک تو خیر یہ بہت پُرانے درخت ہیں دوسرے اسلام اور اسلامی روایت کی علامت بھی ہیں۔ اس لئے میں ان کا دلدادہ ہوں"۔

Marfat.com

یہ "اشجار حفیظ جالندھری" ابھی تک سرسبز و شاداب ہیں، اور زبان حال سے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ حفیظ صاحب کو پرانی چیزوں سے گہری دلچسپی تھی، وہ درختوں کے شیدائی سبزے کے والا و شیدا اور اسلامی روایت کی علامتوں کے دلدادہ تھے۔

حفیظ صاحب کی رگوں میں راجپوتوں کا خون تھا۔ اسی لئے وہ کھرے آدمی تھے۔ حق بات کہتے تھے، ڈرتے نہیں تھے۔ کوئی بات ناگوار خاطر ہو تو بگڑ بھی جاتے تھے۔ کسی سے نظریاتی اختلاف ہو تو برملا اس کا اظہار کرتے تھے۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ بعض اوقات اختلاف کا یہ برملا اظہار اُن کی شخصیت کے حُسن کو مجروح بھی کر دیتا تھا لیکن اُن کی کیفیت ایسے مواقع پر کچھ ایسی ہو جاتی تھی کہ طبیعت کا بند ٹوٹ جاتا تھا، اور وہ نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ جاتے تھے۔ یہ صاف گوئی ان کی کمزوری بھی تھی اور بلند کرداری بھی!

ایک دن ہم لوگ لاہور سے کسی سیمینار میں شرکت کے لئے کراچی جا رہے تھے۔ میں، حفیظ صاحب اور لاہور کے کچھ دوسرے ادیب ایک ہی جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ ہم سب جہاز میں جا کر بیٹھے تو حفیظ صاحب نے ایئر ہوسٹس سے اخبار طلب کیا۔ وہ لڑکی یا تو مصروف تھی یا بھول گئی، خاصی تاخیر سے اخبار لائی۔ حفیظ صاحب ناراض ہو گئے، اور اس لڑکی پر بُری طرح برس پڑے۔ ایک شخص ہمارے قافلے میں ایسا بھی تھا جو پھکڑ پن اور بے محل بات کرنے، اور مبتذل فقرے تراشنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ وہ حفیظ صاحب کے پیچھے کی نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے آداب سے گری ہوئی کوئی بات کہی، اور ایسا فقرہ تراشا جو تہذیب و شائستگی کے منافی تھا۔ اس شخص کی یہ مبتذل بات حفیظ صاحب کو ناگوار گذری لیکن پی گئے اور طرح دے گئے۔ جہاز میں ایک لفظ نہیں بولے۔

جب جہاز کراچی پہنچا، اور ہم لوگ جہاز سے اُتر کر لاؤنج میں جانے کے لئے بس میں بیٹھے، تو وہ شخص حفیظ صاحب کو بنانے بلکہ ستانے کے خیال سے

Marfat.com

اور مزید متذل فقرے تراشنے کی غرض سے ان کے برابر بیٹھا۔ یہ شخص نہایت بے ہنگم قسم کا آدمی تھا۔ حفیظ صاحب کی طبیعت اُس کو دیکھ کر رواں ہوگئی۔

کہنے لگے "جناب! یہ صحیح ہے کہ آپ پہاڑ ہیں۔ ہم آپ پر چڑھ تو نہیں سکتے البتہ آپ کے اندر چھید ضرور کر سکتے ہیں۔ فرمایئے، چھید کروانے کے لئے تیار ہیں"؟

یہ بات سُن کر ہمارے تمام ساتھی بے اختیار قہقہے لگانے کے لئے مجبور ہو گئے۔ ضبط نہ کر سکے۔ محفل زعفران زار بن گئی۔

وہ شخص شرمندہ ہوا، اور اس کا رنگ زرد ہوگیا۔ چہرے پر مُردنی سی چھا گئی۔ پسینہ آگیا۔ اس کا کریہہ جسم مٹی کا تودہ بن گیا، اور اس کا سارا وجود تارتار ہوگیا۔ اس طرح کہ کاٹو تو لہو نہیں۔

حفیظ صاحب نہایت معنی خیز نظروں سے کبھی اُس شخص کی طرف اور کبھی احباب کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ شخص کھسیانی ہنسی ہنستا رہا!

اور میں زیرِ لب مُسکرا کر خاموشی کی زبان میں حفیظ صاحب کی ذہانت بے باکی اور بذلہ سنجی کی داد دیتا رہا!

Marfat.com

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

ڈاکٹر سیّد عبداللہ اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود ایک اچھے انسان، ایک شفیق اُستاد، ایک بلند پایہ مُحقق، ایک اہم نقاد، ایک نامور ادیب اور اُردو کے ایک جاں باز سپاہی تھے۔ اُن کی وفات سے اُردو کی ادبی دُنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی بھی پُر نہیں ہو سکے گا۔ اُن کی باغ و بہار شخصیت کی یاد اُن کے ہم عصروں، شاگردوں، دوستوں اور رفقائے کار کے دلوں میں آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی سی حسین تھرتھراہٹ اور سبزہ زاروں میں جگنوؤں کی سی دلفریب جگمگاہٹ کا روپ اختیار کر کے رہتی دُنیا تک مچلتی اور اُن کی شخصیتوں کے شبستانوں میں دھومیں سی مچاتی رہے گی۔

لاہور آنے سے قبل سید صاحب سے غائبانہ تعارف بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے توسط سے دِلّی میں ہوا۔ وہ مولوی صاحب مرحوم کے رفیق دیرینہ تھے، اور اُردو کے معاملے میں اُن کے خیالات و نظریات مولوی صاحب کے خیالات و نظریات سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ مولوی صاحب مرحوم اکثر مجھ سے سیّد صاحب کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتے تھے اور انہیں اُردو کا ایک عاشق صادق اور ایک جاں باز سپاہی سمجھتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اُن کے تحقیقی مقالات انجمن ترقی اُردو کے رسالہ اُردو اور اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوتے تھے۔ ابھی اُنہوں نے دوسرے رسالوں میں لکھنا شروع نہیں کیا تھا۔ نئے انداز کے تنقیدی مقالات بھی انہوں نے ابھی تک نہیں لکھے تھے، اور وہ صرف اورینٹل کالج کی

Marfat.com

تحقیقی روایت کے ایک علم بردار کی حیثیت سے اُردو کی ادبی دُنیا میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ میں اُن دنوں اُن کی تحقیق کے انداز و اسلوب سے متاثر تھا، اور اُن کے تحقیقی مقالات شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ بابائے اُردو نے یہ اطلاع بھی بہم پہنچائی تھی کہ وہ اورینٹل کالج کے ساتھ منسلک ہیں، اور پنجاب یونیورسٹی کے بین الاقوامی شہرت کے اس ادارے میں تدریس و تحقیق کا کام کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلات کا مجھے علم نہیں تھا۔

جب میں قیام پاکستان کے بعد اورینٹل کالج کے شعبۂ اُردو میں آیا تو اُن سے باقاعدہ تعارف ہوا اور انہیں تقریباً تیس پینتیس سال تک بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

سید صاحب اس وقت اُردو کے ریڈر ہو چکے تھے، اور پنجاب یونیورسٹی میں قیام پاکستان کے بعد اُردو کا جو شعبہ قائم ہوا تھا، اُس کے صدر بھی تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے اُس زمانے کے وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک مرحوم اور اورینٹل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر برکت علی قریشی مرحوم نے مجھے سینئر لیکچرار کی جگہ پر شعبۂ اُردو میں کام کرنے کے لیے خصوصی آفر بھیجا تھا، اور میں نے تقریباً سال بھر کی خط و کتابت کے بعد اس کو قبول کر لیا تھا۔ اس وقت ریڈر کی کوئی جگہ شعبے میں نہیں تھی۔ اس لئے مجھے اس یقین دہانی کے ساتھ بلایا گیا تھا کہ ریڈر اور سینئر لیکچرار میں صرف سو روپے کا فرق ہے۔ شعبے میں ریڈر کی ایک مزید اسامی جلد ہو جائے گی۔ فی الحال میں سینئر لیکچرر کی جگہ کو قبول کر لوں۔ چند مہینے بعد مجھے ریڈر اور پھر پروفیسر بنا دیا جائے گا۔ اس یقین دہانی کے بعد ریڈر کی تنخواہ پر میں لاہور آ گیا تھا اور میں نے شعبے میں سب سے زیادہ سینئر اُستاد کی حیثیت سے کام شروع کر دیا تھا۔

لاہور شہر میں ایک نو وارد اور اجنبی کی طرح جب میں اورینٹل کالج پہنچا تو میں نے ایک چپراسی سے پوچھا "ڈاکٹر عبداللہ کہاں بیٹھتے ہیں؟ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرا نام ڈاکٹر عبادت ہے۔ دِلّی سے آج ہی لاہور آیا ہوں۔ کیا اُن سے ملاقات ہو سکتی ہے"؟

یہ کالج کا پُرانا چپراسی مہر دین تھا۔ نہایت مُہذّب اور شائستہ آدمی تھا، فصیح اُردو میں اُس نے کہا "میرے ساتھ تشریف لائیے۔ ڈاکٹر عبداللہ اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ میں انہیں اطلاع دیتا ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ مجھے ڈاکٹر عبداللہ کے کمرے میں گیا۔ انہیں میرے آنے کی اطلاع دی۔ سید صاحب فوراً باہر تشریف لے آئے، مجھے خوش آمدید کہا، معانقہ کیا، حال احوال پوچھا، اور بڑی محبت سے مجھے

Marfat.com

اپنے کمرے میں لے گئے۔ اپنے پاس بٹھایا۔ چائے منگوائی اور مجھ سے باتیں کرنے لگے۔
کہنے لگے "آپ کب تشریف لائے"؟
میں نے کہا میں آج ہی دِلی سے بذریعہ ہوائی جہاز لاہور پہنچا ہوں۔ آپ سے مِلنے کا اشتیاق تھا سوچا آج ہی آپ سے مل لوں۔ چنانچہ بغیر اطلاع کے حاضر ہو گیا"۔
سید صاحب کہنے لگے "میں تو کئی مہینے سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ مختلف ذرائع سے یہ خبریں ملتی رہتی تھیں کہ آپ جلد آنے والے ہیں۔ میں روزانہ آپ کا انتظار کرتا تھا۔ شکر ہے کہ آپ آ گئے"۔
میں نے کہا بس میں پہنچ گیا۔ آپ کی محبت مجھے کھینچ لائی۔ آگ اور خون کے طوفانوں میں سے گذر کر آیا ہوں۔ اس خیال سے کہ لاہور میں مجھے سکون ملے گا، اور میں یہاں اطمینان سے کام کر سکوں گا۔ دِلی میری آنکھوں کے سامنے تباہ ہوئی۔ قتل و غارت گری کے ایسے ایسے مناظر میں نے دیکھے ہیں کہ اُن کے خیال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کسی غیبی مدد سے میری جان بچ گئی، اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔ شکر ہے کہ میں پاکستان پہنچ گیا، اور اب لاہور میں ہوں جو میرے خوابوں کا شہر ہے۔ اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ مجھے اس شہر میں بقیہ زندگی بسر کرنے اور کام کرنے کا موقع ملا ہے"۔
سید صاحب نے میری یہ بپتا سُن کر میرے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا کہ "آپ یہاں انشاء اللہ اطمینان اور سکون سے رہیں گے، اور آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔ آپ اچھی پوزیشن میں یہاں آئے ہیں۔ یہاں آپ کو ادبی کام کرنے کے مواقع بھی ملیں گے۔ طالب علم بھی آپ کے علم اور تعلیمی تجربے سے استفادہ کریں گے"۔
میں نے کہا میں اسی مقصد سے یہاں آیا ہوں۔ لاہور کی علمی ادبی روایت اور اورینٹل کالج کی بین الاقوامی شہرت مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ میں اپنے فرائض کو انشاء اللہ خلوص اور تن دہی سے انجام دوں گا"۔
سید صاحب کہنے لگے "اُس کالج میں عربی اور فارسی کے شعبے تو خاصے قدیم ہیں۔ اُردو کا شعبہ ابھی نیا نیا کھُلا ہے۔ آپ کو اس نئے شعبے میں کام کرنے کا خوب موقع مِلے گا"۔
غرض اس طرح ہم لوگ دیر تک باتیں کرتے اور چائے پیتے رہے۔ پھر سید صاحب نے پچھتر روپے اپنی جیب سے نکالے اور کہا کہ آپ اپنے لئے ایک نئی میز خرید لیجئے۔ پُرانی میز تو آپ

Marfat.com

کے کمرے میں موجود ہے اور کمرہ بھی سجا دیا گیا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنی پسند کی ایک نئی میز بھی خرید لیں۔ آپ کو اس کی ضرورت ہوگی"۔

پھر سید صاحب نے مجھے ام۔اے اُردو کا ٹائم ٹیبل دیا، اور کہنے لگے "آپ تنقید اور شاعری پر کل ہی سے لکچر دینے شروع کر دیجئے۔ میں طالب علموں کو اطلاع دے دوں گا"۔

میں نے دوسرے دن صبح سے لکچر دینے کا وعدہ کر لیا، اور اس طرح تدریس کا کام شروع ہو گیا۔

ام۔اے میں اس وقت کوئی ڈیڑھ سو کے قریب طالب علم تھے۔ اِن میں کچھ ادیب اور شاعر بھی تھے جنہوں نے اُردو زبان و ادب سے دلچسپی کی وجہ سے داخلہ لے لیا تھا۔ لڑکیاں بھی خاصی تعداد میں تھیں۔ بعض ایسے لوگ بھی تھے جو دفتروں میں کام کرتے تھے۔

میں نے دوسرے دن صبح سے ان طلباء و طالبات کو پڑھانا شروع کر دیا۔ لکچر کے بعد میں یا تو اپنے کمرے میں بیٹھتا تھا یا سید صاحب کے کمرے میں جا کر اُن سے باتیں کرتا تھا۔ سید صاحب مجھے چائے پلاتے تھے، اور مجھ سے مختلف موضوعات پر دلچسپ باتیں کرتے تھے۔

اورینٹل کالج میں آنے سے قبل میرا یہ خیال تھا کہ ڈاکٹر عبداللہ معمر انسان ہوں گے۔ اُن کے چہرے پر داڑھی ہوگی، اور وہ مشرقی لباس پہنتے ہوں گے۔ لیکن جب اُن سے مُلاقات ہوئی تو دیکھا کہ وہ کلین شیو ہیں، سوٹ پہنے ہوئے ہیں، اور ٹائی لگائے ہوئے ہیں۔ اُن کا دفتر بھی مغربی انداز کا ہے، اور باقاعدگی بھی اُن کے مزاج میں بہت ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اورینٹل کالج میں پروفیسر وولنر کا زمانہ دیکھا تھا جو عرصے تک کالج کے پرنسپل، سنسکرت کے پروفیسر اور بعد میں یونیورسٹی وائس چانسلر بھی رہے، انہوں نے جو ماحول اس کالج میں پیدا کیا تھا، اُس کے اثرات سید صاحب پر بہت گہرے تھے۔ اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سید صاحب مغرب سے برگشتہ نہیں ہیں، اور ان کے مزاج میں روشن خیالی کا رنگ رچا ہوا ہے۔

میں نے ایک دن اُن سے اس کا اظہار کیا تو سید صاحب کہنے لگے "میں نے مسجدوں اور مکتبوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ لیکن اورینٹل کالج میں آ کر جب میں نے بڑے بڑے پروفیسروں

Marfat.com

اور اسکالروں کو دیکھا تو مجھ پر مغرب کا اثر ہونے لگا۔ میں نے رہن سہن کے طور طریقے انہیں لوگوں سے سیکھے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ میرا مزاج مشرقی ہے، اور میں عربی فارسی اور اُردو زبانوں اور ان کے ادبیات کا عاشق ہوں"۔

ڈاکٹر عبداللہ کے مزاج میں باقاعدگی بہت تھی۔ وہ ہمیشہ باقاعدگی سے کالج آتے تھے، اور کئی گھنٹے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ ہمیشہ سوٹ پہنے رہتے تھے اور ٹائی لگائے رہتے تھے۔ شدید گرمی کے موسم میں بھی اُن کے اس لباس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اکثر تو یہ دیکھا کہ وہ اکیڈمک گاؤن بھی پہنے رہتے تھے۔ لیکچر دینے کے لئے کلاس میں جاتے تو ہمیشہ گاؤن پہن کر جاتے، اور کمرے میں واپس آکر جب دفتر کا کام کرتے تب بھی گاؤن اُتارتے نہیں تھے۔ اُن کے آس پاس فائلوں اور کاغذوں کا انبار لگا رہتا تھا۔ وہ ان فائلوں کو پڑھتے، اُن پر نوٹ لکھتے۔ ہیڈ کلرک اور اسٹینوگرافر کو خط لکھواتے، ڈکٹیشن دیتے، اور پین بک میں درج کروا کے استادوں تک کو یہ خط پہنچاتے۔ اُن کے کمرے کے دروازے پر باہر کی طرف سادے کاغذ کی چٹیں لٹکی رہتی تھیں۔ اور ایک چپراسی دروازے کے سامنے تپائی پر بیٹھا رہتا تھا۔ کوئی ملنے والا آتا تو وہ اس سے کہتا "آپ چٹ پر اپنا نام لکھ دیجئے" ملاقاتی اپنا نام لکھتا۔ چپراسی اُس چٹ کو اندر لے جاتا۔ سید صاحب کو دیتا۔ پھر واپس باہر آکر کہتا "اندر تشریف لے جائیے"۔ وہ اندر جاتا۔ سید صاحب سے ملتا، باتیں کرتا اور پھر رخصت ہو جاتا۔ کوئی اہم شخص ہوتا تو سید صاحب اس کو باہر تک رخصت کرنے کے لئے آتے۔ اگر سید صاحب فارغ نہ ہوتے تو ملاقاتی کو سٹاف روم میں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی طالب علم ملنے کے لئے آیا۔ اُس نے اپنا نام لکھ کر چٹ اندر بھجوائی۔ سید صاحب نے اُس پر لکھا "کام؟"، اُس نے شرارت سے اس پر لکھا "سلام" اور وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا۔

غرض دن بھر سید صاحب کے ہاں یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ صرف کالج کے اساتذہ کے لئے اس کی پابندی ضروری نہیں تھی، اور وہ بغیر کسی روک ٹوک کے سید صاحب سے مل سکتے تھے البتہ طالب علموں کو اس کی پابندی کرنی پڑتی تھی۔

مجھے تو یہ انداز پسند نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے اس انداز میں بیوروکریسی اور نوکر شاہی کی بو سی ہوتی

Marfat.com

نظر آتی تھی۔ میں اس کی پابندی کبھی نہ کر سکا۔ پروفیسر، پرنسپل اور ڈین ہونے کے بعد بھی میرے دروازے ہر شخص کے لئے کھلے رہے۔ چپٹیں غائب ہو گئیں اور چپراسی دروازے کے سامنے بیٹھا ہوا اونگھتا رہا۔

ڈاکٹر عبداللہ کا یہ بیوروکریٹک انداز کچھ تو اورینٹل کالج کے انگریز پروفیسروں کی روایت کی پاسداری کا نتیجہ تھا، اور کچھ مصروفیت بھی تھی، لیکن اس میں کچھ رعب اور دبدبے کا اظہار بھی تھا۔ اور سید صاحب یہ سب کچھ کرنے کے لئے مجبور تھے۔ اس کی وجہ بنیادی طور پر نفسیاتی تھی۔ ویسے سید صاحب اس کے باوجود ملنے والوں سے اچھی طرح ملتے تھے، اور تہذیب و شائستگی کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ دیر تک باتیں کرتے تھے۔ اس کو چائے پلاتے تھے اور اُن میں سے بیشتر کا کام بھی کر دیتے تھے۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے "ہم لوگ یہاں اسی لئے بیٹھے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئیں۔ ان کے مسائل کو سُنیں، جو مدد اُن کی کر سکتے ہیں وہ کریں، اور اُن کا جو کام ہم سے ہو سکتا ہے، وہ کر دیں"۔

میں اِن باتوں کو چُپ چاپ سُنتا رہا۔

پھر کہنے لگے "میں نے اس یونیورسٹی کے بیشتر امتحانات پرائیویٹ حیثیت سے دیئے ہیں۔ اس کے لئے امتحان کے فارم پر کسی پرنسپل کے دستخط ضروری ہوتے تھے۔ اس زمانے میں بیشتر کالجوں کے پرنسپل دستخط کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ طالب علم اس کے لئے مارے مارے پھرتے تھے۔ اس زمانے میں ڈی۔ اے۔ وی کالج کا ایک ہندو پرنسپل خدمت کے جذبے کے تحت یہ خدمت انجام دیتا تھا۔ کبھی کسی سے انکار نہیں کرتا تھا۔ اس کے دروازے ہمیشہ ایسے طالب علموں کے لئے کھلے رہتے تھے۔ طالب علم اس کے کمرے میں اس کام کے لئے داخل ہوتے تو وہ کہتا "بچہ! بیٹھ جا، میں ہُونے کرنا (یعنی بچے! بیٹھ جا، میں ابھی تمہارا کام کرتا ہوں"۔

غرض سید صاحب طالب علموں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ اس وجہ سے کہ انہیں اپنی طالب علمی کا ابتدائی زمانہ یاد آجاتا تھا۔ وہ خود بھی اِن منزلوں سے گذرے تھے۔

ڈاکٹر عبداللہ تدریسی باقاعدگی سے اپنے طالب علموں کو لیکچر دیتے تھے۔ دفتری کام اِن راہ

Marfat.com

میں حائل نہیں ہوتا تھا۔ یونیورسٹی کی مختلف کمیٹیوں کی میٹنگیں تک اس معاملے میں اُن کا راستہ نہیں روکتی تھیں۔ وہ بڑی محنت سے اپنے لکچر تیار کرتے تھے، اور خاصی دیر تک پڑھاتے تھے۔ کتابیں اور نوٹس اپنے ساتھ کلاس میں لے جاتے تھے، مزے لے لے کر لکچر دیتے تھے، اور اُن کے طالب علم اُن کے دلچسپ لکچروں کو سُن کر جھومتے تھے۔

لکچر سے قبل ان کا چپراسی گُل محمدؐ کتابیں نوٹس اور رجسٹر وغیرہ لے کر پہلے کلاس روم میں جا کر میز پر رکھ دیتا تھا اور یہ گویا اس بات کا اعلان ہوتا تھا کہ سید صاحب لکچر دینے کے لئے آرہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں سید صاحب اکیڈمک گاؤن پہن کر خراماں خراماں لکچر روم کی طرف جاتے تھے۔ پہلے حاضری لیتے تھے پھر دو چار مزے دار باتیں کرتے تھے، اور پھر اُن کے لکچر کا آغاز ہوتا تھا۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ وہ لکچر ضرور دیتے تھے جس سے وہ خود بھی محظوظ ہوتے تھے اور طالب علموں کو بھی محظوظ کرتے تھے۔

ڈاکٹر عبداللہ بنیادی طور پر ایک عالم، محقق، نقاد اور ادیب تھے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی انہیں علمی کاموں میں گذار دی۔ لکھے پڑھنے کے علاوہ انہوں نے کوئی اور کام نہیں کیا۔ اپنی ملازمت کے ابتدائی زمانے میں عرصے تک وہ پرانے انداز کے تحقیقی مقالے لکھتے رہے جن میں سے بیشتر اورنٹیل کالج میگزین میں شائع ہوئے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد جب شعبے میں نئے انداز کے لکھنے والے آگئے تو انہوں نے ان کی دیکھا دیکھی نئے انداز کے تنقیدی مقالے بھی لکھنے شروع کئے، اور اس طرح نئے لکھنے والوں کی صفِ اول میں اپنی جگہ بنالی، اور ادب و تنقید کی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کرلیا۔ انہوں نے اس زمانے میں میرؔ پر کام کیا، غالبؔ، ولی، خواجہ میر دردؒ کے مختلف پہلوؤں پر تنقیدی مضامین لکھے، جدید شاعروں کا بھی بغور مطالعہ کیا، اور اُن پر بھی اعلےٰ درجے کے تنقیدی مقالے لکھے۔ نثر نگاروں پر بھی لکھا۔ علامہ اقبالؒ پر بھی قابل قدر کام کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا شمار نئے نقادوں میں ہونے لگا۔ یہ سب کچھ اُن کی محنت اور جذب و شوق کا نتیجہ تھا۔ اس طرح اپنے آپ کو بدلنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ سید صاحب ہی کر سکتے تھے!

ایک دن مجھ سے کہنے لگے "آپ لوگ جس طرح کے تنقیدی مقالے مختلف موضوعات پر

Marfat.com

لکھتے ہیں ان کو دیکھ کر مجھے رشک آتا ہے۔ میں اِن مضامین کو شوق سے پڑھتا ہوں، اور کوشش کرتا ہوں کہ میں بھی اس قسم کے مضامین لکھوں"۔

یہ سن کر میں نے کہا "سید صاحب! یہ آپ کا حُسن ظن ہے۔ ہم نے کون سا تیر مارا ہے؟ آپ تو ماشاءاللہ ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ آپ روشن خیال بھی ہیں۔ آپ کا مزاج تجزیاتی بھی ہے۔ جو مضامین آپ نے اب تک لکھے ہیں وہ بہت وقیع ہیں۔ آپ تو ہر طرح کے مضامین لکھ سکتے ہیں۔ آپ تنقیدی مضامین ضرور لکھیئے۔ ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو اِن سے بہت فائدہ ہوگا"۔

چنانچہ سید صاحب نے اپنی تحریروں کا انداز بدلا، اور مختلف موضوعات پر تقریباً تیس چالیس سال تک ایسے مضامین لکھے جن میں نیا رنگ و آہنگ تھا۔ مرتے دم تک اُن کا قلم رکا نہیں۔ بس لکھتے رہے، لکھتے رہے اور اُن کی ایسی تحریروں سے ادب و تنقید میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

اُن کی بڑائی اس میں تھی کہ وہ اپنی تحریروں کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ نہ انہیں ان تحریروں پر ناز تھا۔ اوچھے لوگوں کی طرح وہ خود اُن کے بارے میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے تھے جس سے اُن کی اہمیت ظاہر ہوتی ہو۔ حالانکہ وہ خاصی اہم تحریریں تھیں۔ اس معاملے میں ان کے ہاں کسرِ نفسی تھی۔ وہ بڑے اسکالر، محقق، ادیب اور نقاد تھے، اور اُن کی یہ کسرِ نفسی اُن کی بڑائی پر صداقت کی مہر لگاتی ہے۔ دوسرے لکھنے والوں کی وہ ہمیشہ تعریف کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی لکھنے والے کے بارے میں منفی خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ کبھی کسی کے خلاف کچھ نہیں لکھا، کبھی کسی کے بخیے نہیں اُدھیڑے، کبھی کسی کی دھجیاں نہیں اُڑائیں۔ اُن کا قلم ہمیشہ مثبت راہوں پر چلتا تھا۔ وہ ہر لکھنے والے کی عزت کرتے تھے، اور یہ بات بہ حیثیت ادیب محقق اور نقاد اُن کی شخصیت کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔

سید صاحب سیاسی آدمی نہیں تھے لیکن سیاست سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ سیاست میں وہ خاصے روشن خیال تھے۔ یونیورسٹی کی ملازمت نے انہیں عملی سیاست کے کوچے میں قدم رکھنے سے باز رکھا۔ البتہ نجی صحبتوں میں وہ سیاست پر بصیرت افروز باتیں کرتے تھے۔ طبیعت کے اس سیاسی میلان نے انہیں یونیورسٹی کی سیاست میں حصہ لینے کے لئے مجبور کیا۔ لیکن اُن کی یہ سیاست اپنی ذات، اپنے بعض ہم خیال لوگوں کی امداد، اور منٹل کالج اور مشرقی علوم کے

Marfat.com

فروغ، اور اُردو زبان کی ترویج و ترقی کی طرف لے گئی، اور انہوں نے شمشیر برہنہ ہو کر ان کے لئے کام کیا۔ بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے اور بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ وہ ان میدانوں میں چومکھی لڑائی لڑتے تھے، اور ان معاملات میں انہیں خاصی کامیابی ہوتی تھی۔ انہوں نے مسجدوں اور مکتبوں سے نکل کر معمولی کلرکی کی، اور وہاں سے پروفیسری اور پرنسپلی تک پہنچے۔ انہوں نے اپنے آس پاس بعض ایسے لوگوں کو جمع کیا جو بظاہر تو اُن کے جاں نثار تھے لیکن بہت چھوٹے لوگ تھے۔ سید صاحب نے اِن کو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ لیکن المیہ یہ ہوا کہ وہ اُن کے نقش قدم پر نہ چل سکے۔ چلتے کیسے اُن میں تو چلنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ سیّد صاحب نے بقول شخصے پہیّے لگا کر اُن کو رواں کرنے اور چلانے کی کوشش کی اور طبیعت کے اوچھے پن کی وجہ سے نادان دوست ثابت ہوئے۔ اِن لوگوں نے کسی شعبے میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا کیونکہ اُن کے اندر کوئی صلاحیت نہیں تھی۔ اس لئے وہ سید صاحب کی بدنامی کا باعث بنے۔ اس بات کا سید صاحب کو صدمہ بھی ہوا۔ ان لوگوں کو سوائے شہرپسندی کے اور کوئی کام آتا ہی نہیں تھا۔ سید صاحب اس کے شکوہ سنج تھے، اور اکثر نجی صحبتوں میں اس حقیقت کا اظہار کرتے تھے کہ ان نادان دوستوں نے دانا دوستوں کو میرا دشمن جاں بنا دیا ہے۔ اس کے باوجود سید صاحب نے اورینٹل کالج اور مشرقی علوم اور خصوصاً اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے قابل قدر کام کیا، اور اپنی بصیرت، تدبر اور فکر و عمل کی بدولت انہیں اس کام میں خاصی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

اورینٹل کالج کو انہوں نے نہ صرف زندہ رکھا، بلکہ اس کی روایت کو ترقی سے ہم کنار کیا، اور اس کو تدریس و تحقیق کا ایک اہم ادارہ بنا دیا۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ میں بعض مغرب زدہ لوگ اورینٹل کالج کے سخت خلاف تھے، اور اس کو سفید ہاتھی سمجھتے تھے۔ کئی دفعہ ان لوگوں نے ایسے منصوبے بنائے کہ اورینٹل کالج کو ختم کر کے صرف عربی، فارسی اور اُردو کے شعبے قائم کر دیئے جائیں۔ فیسیں بھی یونیورسٹی کے دوسرے شعبوں کے برابر ہوں۔ کیونکہ اورینٹل کالج میں پہلے صرف آٹھ آنے فیس لی جاتی تھی۔ بعد میں پانچ روپے کر دی گئی۔ یہ بات انتظامیہ کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی، اور وہ بار بار اورینٹل کالج کو ختم کرنے کے منصوبے بناتے تھے۔ اس میں سب سے زیادہ پیش پیش میاں فضل حسین صاحب تھے، جو کئی بار یونیورسٹی کے وائس چانسلر

Marfat.com

رہ چکے تھے، اور نہایت قابل آدمی تھے لیکن اورینٹل کالج کا مشرقی انداز انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ سید صاحب نے اُن سے ٹکر لی، اور اس میں شبہ نہیں کہ ڈاکٹر عبداللہ کی مسلسل کوشش کی بدولت اورینٹل کالج زندہ اور برقرار رہا، اور اس کی عظیم روایت قائم رہی۔

سید صاحب ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ "میاں صاحب ہمیشہ سے اورینٹل کالج کو پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ مغرب کے تعلیم یافتہ ہیں، اور مشرقی علوم سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے اُن کا خیال ہے کہ اورینٹل کالج جدید ماحول اور نئی زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس کے اساتذہ اور طالب علم دونوں جدید دور کی تہذیب اور اس کی ترقی سے ناآشنا ہیں۔ صرف پرانی دقیانوسی کتابوں سے اُن کا تعلق ہے۔ چند سال قبل جب اُردو کے لیکچرشپ کے لئے میں اُن کے سامنے انٹرویو میں پیش ہوا تو اُنہوں نے اُردو زبان و ادب پر سوال کرنے کی بجائے یہ سوال پوچھا کہ "کیا آپ کو سائیکل چلانی آتی ہے؟" میں نے کہا جی نہیں میں پیدل چلتا ہوں، کتاب پڑھتا ہوں اور قلم چلاتا ہوں"۔ یہ سُن کر وہ چُپ ہو گئے۔ اُن کا مطلب اس سوال سے یہی تھا کہ اورینٹل کالج کے اساتذہ کو کم از کم اس حد تک تو جدید ہونا چاہیئے کہ وہ سائیکل چلا سکیں"۔

میاں صاحب جب دوسری تیسری بار وائس چانسلر ہوئے تو اُنہوں نے اپنے منصوبے پر کام جاری رکھا لیکن اب سید صاحب بہتر پوزیشن میں تھے۔ اس لئے انہوں نے میاں صاحب کے منصوبوں کی ڈٹ کر مخالفت کی، جلسے کئے، جلوس نکالے، کانفرنسیں کیں، اخباروں میں مضامین لکھے، میاں صاحب سے اکیڈمک نوعیت کی خط و کتابت کی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورینٹل کالج کی حیثیت برقرار رہی۔ ہزارہا طالب علموں نے اس سے استفادہ کیا، اور تدریس و تحقیق کی عظیم روایت اس ادارے میں قائم رہی۔ جدید دور میں اس کو مزید فروغ حاصل ہوا۔

اورینٹل کالج کو موجودہ حالت میں برقرار رکھنے کا سہرا اس میں شبہ نہیں کہ ڈاکٹر عبداللہ کے سر ہے، ورنہ یہ اب تک کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا۔

سید صاحب اُردو کے جاں باز سپاہی تھے۔ اُن کے خیال میں یہ زبان اسلامیان ہند کی تہذیب و ثقافت کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے اس زبان

Marfat.com

کو اس کا جائز حق دلانے کے لئے اہم کارنامے انجام دیئے۔ اُنہوں نے اُردو کو دفتری زبان بنانے کے لئے تحریک چلائی۔ انجمن ترقی اُردو کا دفتر لاہور میں قائم کیا۔ مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی کی تشکیل کی اور سائنس کو اُردو میں پڑھانے کی طرف اساتذہ کو توجہ دلائی۔ اُردو میں سائنس کی کتابیں بھی خاصی تعداد میں شائع کیں، سائنس کے موضوعات پر لیکچروں کا انتظام بھی کیا، کئی کانفرسیں کیں۔ اُردو کے لئے جلوس نکالے۔ مال روڈ پر ایک درخت کا نام شجر اُردو رکھا، اور ذاتی طور پر ایک ایک دوکان میں جاکر دوکان داروں کو اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ وہ انگریزی کی بجائے اُردو میں بورڈ لکھوا کر اپنی دوکانوں پر آویزاں کریں۔ اکثر شام کے وقت اُن کا مختصر سا جلوس "شجر اُردو" سے اپنی مہم پر روانہ ہوتا تھا۔ جلوس میں جو کارکن شامل ہوتے تھے، وہ ایک ایک دوکان میں جاتے تھے اور دوکان داروں کو اُردو میں کام کرنے کی طرف توجہ دلاتے تھے، اس قسم کے کاموں سے سید صاحب کا مقصد اُردو کی فضا کو قائم کرنا تھا۔ وہ اس کے لئے منصوبے بھی بناتے تھے اور اِن منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کام بھی کرتے تھے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ اُردو کے مجاہد تھے، اور ایک مجاہد کی حیثیت سے تادم مرگ انہوں نے اس جہاد کو جاری رکھا۔

ڈاکٹر عبداللہ بظاہر کلاسیکی اور قدیم انداز کے انسان نظر آتے تھے لیکن وہ طبعاً رومانی تھے۔ خواب دیکھتے تھے، اور رہ وادی، خیال کو مستانہ طے کرنے کے قائل تھے۔ زندگی کو بسر کرنا اور برتنا انہیں خوب آتا تھا۔ وہ اس سے رس نچوڑنا بھی جانتے تھے۔ اس کی مسرتوں سے سینہ بھر لینا بھی ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ وہ حُسن کے شیدائی تھے۔ حسن صحت کے ساتھ ہم آہنگ ہو تو انہیں بہت متاثر کرتا تھا، اور کبھی کبھی حسن و صحت کے اس امتزاج کو دیکھ کر اُن پر نشہ سا چھا جاتا تھا اور کبھی کبھی اُن کے قدم ڈگمگا بھی جاتے تھے۔ وہ باغوں صحراؤں، جنگلوں، سبزہ زاروں اور پہاڑوں میں جاکر بہت خوش ہوتے تھے۔ سینما بھی دیکھتے تھے، بازاروں کی سیر بھی کرتے تھے، جلسے جلوسوں میں بھی بڑے شوق سے شریک ہوتے تھے۔ اور احباب کی محفلوں میں اپنی بذلہ سنجی اور خوش گفتاری سے گل و گلزار بھی کھلاتے تھے۔ زندہ دلی اور رجائیت پسندی اُن کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت تھی۔ یہ اور بات ہے کہ افسردگی اور افسردہ دلی سے بھی اُن کا رابطہ تھا، اور وہ کبھی کبھی اداس بھی ہوتے اور طرز تپاک اہل دُنیا کو دیکھ کر افسردگی کی آرزو بھی کرتے تھے۔

Marfat.com

۱۹۶۵-۶۶ کے تعلیمی سال میں سید صاحب اورینٹل کالج کی ملازمت سے سبک دوش ہو گئے، لیکن انہوں نے کوشش کر کے ادارۂ معارف اسلامیہ میں اپنے لئے جگہ بنالی، اور کئی سال تک اس ادارے میں انہوں نے قابلِ قدر علمی کام کیا۔ خصوصیت کے ساتھ اُن کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے اس علمی ادارے کو حیاتِ جاوداں سے ہم کنار کرنے کی کوشش کی، اور اس کام میں وہ پوری طرح کامیاب ہوئے۔ حکومت پاکستان نے اُن کی اہمیت کا اعتراف کیا اور یونیورسٹی نے بھی اُن کی عزت افزائی کی۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اُن کی زندگی ہر لحاظ سے ایک کامیاب زندگی تھی۔ وہ مصوف رہنے کو زندگی سمجھتے تھے۔ ہوس زر ان میں نام کو بھی نہیں تھی، اور یہ ایک ایسی خوبی تھی جو مادیت کے اس دور میں خال خال ہی پائی جاتی ہے۔ اس کے لئے تو آج کل چراغ لے کر ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں سید صاحب صحیح معنوں میں درویش تھے۔ انہوں نے کبھی پیسہ جمع نہیں کیا، برخلاف اس کے جو کچھ اُن کے پاس تھا وہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی اہل وعیال کے حوالے کر دیا۔ اس خیال سے کہ اُن کے بعد آپس میں اختلاف نہ ہو۔

تقریباً چالیس سال تک مجھے ڈاکٹر عبداللہ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ وہ میرے رفیق دیرینہ تھے۔ مجھے اُن کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس لئے میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ انہیں کوئی نہیں جانتا۔ میں اُن کی خوبیوں اور خامیوں دونوں سے خوب واقف ہوں۔ اُن کی شخصیت کے بعض ایسے پہلوؤں کا بھی مجھے علم ہے جو ناگفتنی ہیں۔ کیونکہ وہ بہرحال انسان تھے، اور انسان ظاہر ہے کہ فرشتہ نہیں ہوتا۔ اس سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ گناہ بھی سرزد ہو سکتا ہے۔ اس کے قدم ڈگمگا بھی سکتے ہیں۔ وہ پھسل بھی سکتا ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ کی یہ خواہش تھی کہ وہ تاحیات اورینٹل کالج میں رہیں۔ لیکن یونیورسٹی نے اُن کے اس منصوبے کو قبول نہیں کیا، اور اُن کے ریٹائر ہونے کے بعد اُردو کی پروفیسری، شعبۂ اُردو کی صدارت اور اورینٹل کالج کی پرنسپلی کا بوجھ میرے شانوں پر آپڑا۔ میں نے حتی الامکان اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر اس بوجھ کو اُٹھانے کی کوشش کی اور اورینٹل کالج کے لئے جو کچھ

Marfat.com

مجھسے ہوسکتا تھا، وہ میں نے کیا۔ گویا سید صاحب کی بنائی ہوئی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

سید صاحب کو میں نے کبھی آزردہ نہیں ہونے دیا۔ اورینٹل کالج میں آنے اور تدریس و تحقیق کے لئے کچھ وقت دینے کی کئی بار درخواست کی۔ لیکن اُن کی دوسری مصروفیات نے انہیں اس کی اجازت نہیں دی۔ اورینٹل کالج کے علمی ادبی جلسوں میں کئی بار میں اُن کے دولت خانے پر جاکر اصرار کرکے انہیں کالج میں لایا، اور وہ بیگم صاحب اور بچی کے ساتھ بڑی خوشی سے تشریف لائے۔ بعض جلسوں کی صدارت کی۔ اور بعض میں مہمان خصوصی کے فرائض دیئے۔ مجھے خوشی ہے کہ سید صاحب اس سے خوش ہوئے، اور اس صورت ہی میں سہی، اورینٹل کالج سے اُن کا رابطہ قائم رہا۔

سید صاحب بڑے با اخلاق، مہذّب اور شائستہ انسان تھے۔ ہر ایک سے اچھی طرح ملتے تھے، اور نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ڈاکٹر محمد باقر صاحب سے انتظامی معاملات میں اُن کا اختلاف تھا لیکن وہ اُن کی اور اُن کے اہل خاندان کی بڑی عزّت کرتے تھے۔ آج کل کے اوچھے لوگوں کی طرح نہیں کہ کسی بات میں اختلاف ہوا تو دشمنی پر کمر باندھ لی اور ملنا جُلنا، اور بات کرنا اور بولنا تک ترک کر دیا۔ جن لوگوں سے اختلاف ہوتا تھا، اُن کے ساتھ معاشرتی زندگی میں سید صاحب کچھ زیادہ ہی اخلاق کے ساتھ پیش آتے تھے۔ بلکہ ایسے لوگوں کے ساتھ بات چیت اور گفتگو میں اُن کی طرف سے خاصی شگفتگی اور بذلہ سنجی کا اظہار ہوتا تھا۔

ایک شام ہم لوگ ڈاکٹر عبداللہ، ڈاکٹر محمد باقر کسی عشائیے میں مدعو تھے۔ ایسے لوگوں کا مجمع زیادہ تھا جن سے ہماری کوئی ذہنی مناسبت نہیں تھی۔ اس لئے ہم تینوں ایک گوشے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ڈاکٹر باقر صاحب اس زمانے میں اپنے آپ کو ہمیشہ فقیر لکھا کرتے تھے۔

میں نے ازراہ تفنن سید صاحب سے مخاطب ہوکر کہا "ڈاکٹر باقر صاحب اپنے آپ کو آجکل فقیر لکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے انہیں ایسا نہیں کہنا چاہیئے۔ اچھا نہیں لگتا"۔ وہ کہاں کے فقیر ہیں؟

سید صاحب اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے "اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہم سب فقیر ہیں۔ ہم سب کو اپنے آپ کو فقیر سمجھنا چاہیئے، اور فقیر ہی لکھنا چاہیئے"۔

Marfat.com

پھر ڈاکٹر باقر کو مخاطب کر کے کہنے لگے اگر ہم آپ کو ڈاکٹر فقیر کہا کریں تو آپ بُرا تو نہیں مانیں گے؟"

ڈاکٹر باقر نے ہنس کر کہا "مجھے ضرور ڈاکٹر فقیر کہیئے۔ اس لئے کہ میں فقیر ہوں"۔

سید صاحب نے یہ سُن کر میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

اور میں چُپ چاپ اُن کے اس انداز سے محظوظ ہوتا رہا۔ کوئی ایک گھنٹے تک ہم لوگ اس طرح کی دلچسپ گفتگو کرتے رہے۔

ایک دن میں سید وقار عظیم صاحب، سید وزیر الحسن عابدی صاحب کوئی دو بجے تک کالج کے کسی کام میں مصروف رہے۔ دو بجے تو سید صاحب نے کہا "ہم لوگ اگر آج کسی ریستوراں میں دن کا کھانا کھالیں تو کیسا رہے گا؟ گھروں کو جائیں گے تو مزید دیر ہو جائے گی"۔

سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ چنانچہ ہم لوگ کالج سے اُٹھ کر چند منٹ میں مال روڈ کے ایک ریستوران میں پہنچ گئے۔ ویٹر آیا تو سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اور پوچھا "آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟ اپنی اپنی پسند کی چیز بتا دیجئے"۔

سب نے اپنی اپنی پسند کی چیز بتا دی۔ لیکن عابدی صاحب خاموش رہے۔ دیر تک کچھ نہیں بولے۔

سید صاحب نے یہ منظر دیکھ کر برجستہ کہا "عابدی صاحب تو غم کھاتے ہیں، کچھ اور نہیں کھاتے۔ انہیں کچھ اور کھانے کی کیا ضرورت ہے"!

یہ سن کر سب ہنسنے لگے۔ عابدی صاحب بھی زیر لب مُسکرائے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب عابدی صاحب یونیورسٹی کی سیاسی کشمکش اور شعبہ فارسی کی اندرونی سازشوں کی وجہ سے بددل اور اداس رہتے تھے، اور واقعی غم کھاتے تھے۔

ڈاکٹر عبداللہ کے اس فقرے نے محفل کو زعفراں زار بنا دیا۔ عابدی صاحب تک مسکرا دیئے۔ حالانکہ انہیں مسکرانا اور ہنسنا نہیں آتا تھا۔

دو ڈھائی سال اُدھر کی بات ہے میں، ڈاکٹر عبداللہ اور اُن کی بیگم صاحبہ کسی میٹنگ میں شرکت کر کے اسلام آباد سے ایک ہی جہاز میں لاہور واپس آ رہے تھے۔ اس دن کوئی غیر ملکی مہمان

Marfat.com

اسلام آباد آنے والے تھے اس لئے لاہور کے لئے جہاز کوئی چار پانچ گھنٹے کی تاخیر سے چلا۔ ہم لوگ کئی گھنٹے تک ایئرپورٹ پر بیٹھے رہے اور مختلف موضوعات پر آپس میں باتیں کرتے رہے۔

اس روز ڈاکٹر عبداللہ بہت سنجیدہ تھے۔ان کی باتوں میں وہ شگفتگی، شادابی اور بذلہ سنجی نہیں تھی جس سے وہ بزمی محفلوں میں پہچانے جاتے تھے۔

بڑی حسرت سے ڈاکٹر عبداللہ نے ماضی کو یاد کیا اور کہا "ڈاکٹر صاحب! ہمارے زمانے کا اورینٹل کالج کیسا اچھا تھا! ہم لوگ آپس میں کتنی محبت اور کیسی شائستگی سے ملتے تھے۔ اختلاف ان راہوں میں حائل نہیں ہوتا تھا۔ایک دوسرے سے اختلاف بھی کرتے تھے، لیکن عزت اور احترام میں کوئی فرق نہیں تھا۔"

پھر ایک آہ سرد بھر کر کہنے لگے "سُنا ہے اب تو اورینٹل کالج میں صرف اختلافات کی فضا ہے، اب تو لوگ ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے کا اب وہاں کوئی ماحول نہیں ہے۔"

میں نے یہ سُن کر کہا "میرا تو اب اورینٹل کالج سے کوئی رابطہ نہیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد میں کبھی اورینٹل کالج نہیں گیا۔ آپ کی بات صحیح ہے۔ایسے ماحول میں کوئی وہاں کا رُخ کیسے کرے، اور جا کر کرے بھی کیا؟ جس ماحول میں انسانیت اور محبت، تہذیب اور شائستگی نہ ہو اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔"

سید صاحب یہ سُن کر گہری سوچ میں ڈوب گئے اور دیر تک خاموش رہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئے ہیں۔

میں بھی چُپ ہو گیا۔

سیّد صاحب سے یہ میری آخری مُلاقات تھی!

Marfat.com

Marfat.com

پروفیسر سیّد وقار عظیم

پروفیسر سید وقار عظیم صاحب ایک عظیم انسان، ایک شفیق استاد، ایک مخلص دوست، ایک نامور ادیب، ایک متفرد نقاد اور ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ اُن کی ساری زندگی درس و تدریس اور علم و ادب کی آبیاری میں گذری۔ تقریباً نصف صدی تک وہ علمی ادبی کاموں میں مصروف رہے اور اپنی شگفتہ و شاداب تحریروں سے رنگ و نور کے دریا بہاتے رہے۔

میں جوبلی کالج لکھنؤ سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے جب فرسٹ ایئر میں گیا تو اُن سے میرا غائبانہ تعارف ہوا۔ اُن کے چھوٹے بھائی سید معراج عظیم مرحوم اُس زمانے میں میرے ساتھ پڑھتے تھے اور ہر وقت میرا اُن کا ساتھ رہتا تھا۔ ایک دن وہ اپنے ساتھ ایک نئی شائع شدہ کتاب لائے جس کا نام تھا "افسانہ نگاری" اور اس کے مصنف تھے سید وقار عظیم!

انہوں نے مجھے یہ کتاب دکھائی اور کہا کہ "یہ کتاب میرے بڑے بھائی سید وقار عظیم صاحب نے لکھی ہے اور الہ آباد میں چھپی ہے۔ وقار بھائی آج کل الہ آباد ہی میں رہتے ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی سے انہوں نے فرسٹ ڈویژن میں ام۔ اے اُردو کیا ہے۔ انٹرمیڈیٹ انہوں نے ہمارے جوبلی کالج ہی سے کیا تھا، اور وہ یہاں کے اچھے طالب علموں میں شمار ہوتے تھے۔ ہمارے اُستاد حامد اللہ افسر صاحب کے وہ بھی شاگرد رہ چکے ہیں۔ آج کل الہ آباد میں اُن کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گذرتا ہے"۔

میں نے اُن سے کتاب لے کر دیکھی، اور دو تین دن کے لئے اس کو گھر لے گیا۔ شروع

Marfat.com

سے آخر تک اس کو پڑھا۔ معلومات میں اضافہ ہوا، اور لطف آیا۔ افسانہ نگاری کے فن سے شناسائی بھی ہوئی، اور اس فن کو سمجھنے کا شعور بھی میرے اندر بیدار ہوا، اور وقار صاحب کی عظمت کے نقوش بھی میرے دل پر ثبت ہوئے۔

یہ وقار صاحب سے میرا غائبانہ تعارف تھا۔

معراج دو سال میرے ساتھ رہے۔ ہم لوگوں نے ایک ہی سال انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا، اور پاس ہو کر یونیورسٹی میں چلے گئے۔ لیکن معراج عظیم اسی زمانے میں ٹی بی کے موذی مرض میں مبتلا ہوئے اور بالآخر اُن کا انتقال ہو گیا۔ آج بھی اُن کی معصوم شخصیت کی تصویر میری آنکھوں میں سمائی ہوئی ہے۔

میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو وہاں یہ خبر سُنی کہ وقار عظیم صاحب لکچرار کی حیثیت سے یونیورسٹی میں آنے والے ہیں۔ اُن کا تقرر ہو چکا ہے۔ لیکن ابھی اُن کے لکھنؤ آنے میں کچھ وقت اور لگے گا۔ پھر دو تین مہینے گذرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وقار عظیم صاحب کا تقرر کسی وجہ سے نہ ہو سکا، اور اب اُن کی جگہ سید احتشام حسین صاحب یونیورسٹی میں اُردو کے اُستاد کی حیثیت سے آنے والے ہیں۔ اُن کا باقاعدہ طور پر تقرر ہو چکا ہے۔ چنانچہ احتشام حسین صاحب آ گئے۔ انہوں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ ہم لوگوں کو وقار صاحب سے استفادے کا موقع نہ مل سکا۔ چند مہینے کے بعد یہ خبر ملی کہ انہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ملازمت مل گئی ہے، اور انہوں نے وہاں پڑھانا شروع کر دیا ہے۔

اس عرصے میں میں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے اُردو میں بی اے آنرز اور ایم۔ اے کیا، اور پھر مجھے اینگلو عربک کالج دہلی میں اُردو کے لکچرار کی حیثیت سے ملازمت مِل گئی۔ چنانچہ میری ملاقات وقار صاحب سے دِلّی ہی میں ہوئی۔ جامعہ ملیہ میں چند سال گذارنے کے بعد وہ دہلی پولی ٹکنیک میں اُردو کے استاد کی حیثیت سے آ گئے تھے یہ کالج کشمیری دروازے کے باہر تھا۔

ایک دن پالی ٹکنیک میں کوئی ادبی جلسہ تھا۔ اس جلسے میں شرکت کی دعوت مجھے بھی دی گئی تھی۔ میں وقت سے کچھ پہلے ہی پالی ٹکنیک پہنچ گیا۔ وقار صاحب جلسے کے انتظامات میں مصروف نظر آئے۔ میں پچھلی نشست پر چُپ چاپ بیٹھ گیا۔ چند لمحے بھی نہیں گذرے تھے

Marfat.com

کہ وہ میرے پاس آئے اور کہا

"اگر میں غلطی نہیں کرتا تو میرے خیال میں آپ عبادت صاحب ہیں"

میں نے کہا "جی ہاں! آپ سے مِلنے اور دوسرے ادیبوں کو دیکھنے کی خواہش مجھے اس جلسے میں کھینچ لائی ہے"۔ وہ بڑی شفقت اور محبت سے کہنے لگے "بہت اچھا ہوا کہ آپ آگئے۔ آپ سے مِلنے اور باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا"۔

میں نے کہا "آپ کی نوازش ہے۔ آپ سے غائبانہ ملاقات تو کئی سال قبل ہو چکی تھی۔ معراج عظیم نے آپ کا تفصیلی تعارف کروایا تھا۔ آپ کی کتاب بھی مجھے پڑھنے کے لئے دی تھی۔ آپ کے مضامین بھی رسالوں میں پڑھے تھے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ سے نیاز حاصل ہو گیا"۔

پھر انہوں نے پوچھا "انیگلو عربک کالج میں آپ کا دل لگ گیا"؟

میں نے کہا "ابھی تو میں نیا نیا یہاں آیا ہوں۔ زندگی میں پہلی دفعہ لکھنؤ کو چھوڑا ہے۔ دلّی لکھنؤ سے مختلف شہر ہے۔ شروع شروع میں تو طبیعت گھبرائی لیکن اب دل لگ گیا ہے۔ کالج کا ماحول اچھا ہے۔ رفقائے کار محبت سے ملتے ہیں۔ طالب علم بڑے ہی مہذب اور شائستہ ہیں۔ پڑھنے لکھنے کا ماحول بھی ہے۔ اس لئے میرا دل لگ گیا ہے"۔

کہنے لگے "اچھا ہوا۔ آپ کو یہاں ادبی کام کرنے کا اچھا موقع مِلے گا"۔

پھر کہا "آپ بیٹھئے۔ جلسہ شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے۔ میں چند منٹ کی اجازت چاہتا ہوں۔ کسی کو بھیج کر پان منگوالوں۔ بیگم کی فرمائش ہے۔ کہیں بھول نہ جاؤں"۔

میں نے کہا "آپ مصروف رہیئے۔ میں وقت سے ذرا پہلے آگیا ہوں"۔

کہنے لگے "بس، اب لوگ آتے ہی ہوں گے۔ اچھا ہوا کہ آپ جلسہ شروع ہونے سے قبل آگئے۔ لوگوں سے ملاقاتیں ہو جائیں گی"۔

چند منٹ گذرے تھے کہ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب، ڈاکٹر تاثیر، فیض صاحب، حفیظ جالندھری اور بخاری صاحب آگئے اور میں ان سے باتیں کرنے لگا۔

وقار صاحب سے پہلی ہی ملاقات میں میں اُن کی محبت شفقت، ذہانت اور تہذیب و شائستگی

Marfat.com

سے بہت متاثر ہوا۔ جلسہ شروع ہونے سے قبل، اور اس کے بعد بھی انہوں نے مجھ سے دیر تک باتیں کیں۔ ادیبوں سے میرا تعارف بھی کروایا، اور یہ کہہ کر مجھے رخصت کیا کہ "میں تیمار پور میں رہتا ہوں۔ کسی روز گھر پر آیئے تاکہ ذرا تفصیلی مُلاقات ہو۔ کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بے تکلفی سے بتایئے۔ دلی میں اطمینان سے وقت گذاریئے"۔

اس طرح کبھی پاتی کنیک میں کبھی اُن کی جائے قیام پر اور کبھی حمیدہ سلطان صاحبہ کے ہاں سری رام روڈ پر اُن سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ دِلّی کے دوران قیام میں اُن کی وجہ سے مجھے ڈھارس رہی۔ ایک بزرگ مجھے مل گیا، اور یہ میرے لئے دِلّی کے سے اجنبی شہر میں بہت بڑا سہارا تھا۔

کچھ عرصے بعد وقار عظیم صاحب رسالہ آجکل کے اڈیٹر ہو گئے، اور علی پور روڈ پر حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات کے دفتر میں باقاعدگی سے بیٹھنے لگے۔ یہاں تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز اُن سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں یونیورسٹی میں ام۔اے کی کلاس کو لکچر دے کر واپسی پر اُن کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر اینگلو عربک کالج واپس آتا تھا۔

اور پھر پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ وقار صاحب پاکستان جانے کی تیاری کرنے لگے، اور اُن ریلوں میں سے ایک میں مع اپنے خاندان اور عملے کے کراچی چلے گئے جو پاکستان کی وفاقی حکومت کے ملازمین کو لے کر نئی دِلّی کے اسٹیشن سے روانہ ہوتی تھیں۔ جب وقار صاحب روانہ ہوئے ہیں تو میں نئی دِلّی کے اسٹیشن پر موجود تھا۔ میں نے انہیں خدا حافظ کہا، اور وہ ناسازگار حالات کے باوجود خیریت سے کراچی پہنچ گئے جہاں سے انہوں نے کئی سال تک "ماہ نو" نکالا۔

میں مجبوراً تقسیم ہند کے موقع پر برپا ہونے والے آشوب قیامت کو برداشت کرنے کے لئے کچھ عرصے دِلّی ہی میں رہا جب آگ اور خون کے دریاؤں کو تیر کر لاہور پہنچا تو وقار صاحب اس وقت "ماہ نو" کی ملازمت کو چھوڑ کر اُستاد کی حیثیت سے اورینٹل کالج لاہور میں آگئے تھے۔ یہاں اُن کے ساتھ مجھے تقریباً ربع صدی تک کام کرنے کا موقع ملا۔ اور اس طرح اُن کی دلکش شخصیت کے بے شمار پہلو میری آنکھوں کے سامنے آئے۔

دِلّی سے جب میں لاہور پہنچا، اور پہلے دن اورینٹل کالج میں گیا تو وقار صاحب سے میری مُلاقات ہوئی۔ وہ اس زمانے میں کالج کی دوسری منزل پر اس کمرے میں بیٹھتے تھے جس میں تقسیم ہند

Marfat.com

سے قبل ڈاکٹر لکشمن سروپ بیٹھتے اور کام کرتے تھے۔ اُن کی لائبریری بھی اسی کمرے میں تھی۔ ڈاکٹر عبداللہ سے مل کر میں اوپر پہنچا، اور اُن کے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ وہ کتابوں اور کاغذوں میں گھرے ہوئے بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ مجھے گلے لگایا اور بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھایا۔ حال احوال پوچھا، اور کہنے لگے "آپ کے آنے کا علم ہو گیا تھا، اور میں بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ شکر ہے کہ آپ بخیریت لاہور پہنچ گئے"۔

میں نے کہا "نہ جانے یہاں پہنچنے کے لئے کیا کیا جتن کئے ہیں۔ آفر تو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے سال بھر ہوا مل گیا تھا۔ لیکن دلّی سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر صاحب اور پروفیسر مرزا محمود بیگ صاحب، اینگلو عربک کالج کے مفاد کے پیش نظر مجھے وہاں روکے ہوئے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ عربک کالج کے چند پرانے پروفیسروں کو اُس وقت تک دلّی میں رہنا چاہیئے جب تک کالج میں حالات معمول پر نہ آ جائیں۔ چنانچہ وہاں رُکا رہا حالانکہ دلّی میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ دلّی اب پہلے کی سی دلّی نہیں رہی ہر طرف ہندو اور سکھ نظر آتے ہیں۔ وقفے وقفے سے فساد بھی ہوتا رہتا ہے۔ ایسے میں جی کیسے لگتا!" ذاکر صاحب مجھے شانتی نکیتن کی پروفیسری پر بھیج رہے تھے۔ تقرری کا خط بھی آ گیا تھا لیکن بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے روک لیا۔ اور پنجاب یونیورسٹی کا آفر بھجوا دیا۔ بڑی مشکل سے یہاں پہنچا ہوں۔ بڑے بڑے ہنگامے دیکھ لئے۔ یوں سمجھئے کہ آگ اور خون کے دریا سے نکل کر آیا ہوں۔ بس اب صرف یہ خواہش ہے کہ یہاں کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اب پریشانی کے عالم میں زندگی بسر کرنے کی سکت نہیں رہی"۔

وقار صاحب نے یہ باتیں سُن کر مجھے تسلی دی، اور کہا "اب یہاں پاکستان میں حالات اچھے ہیں۔ یہاں آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اورینٹل کالج کی اب تنظیم نو ہو رہی ہے۔ کالج کے مستقل پرنسپل ڈاکٹر برکت علی قریشی سفیر ہو کر لبنان چلے گئے تھے۔ اب سنا ہے کہ واپس آنے والے ہیں۔ اُردو کا شعبہ نیا نیا کھُلا ہے۔ ایم۔اے اُردو میں طالب علموں کی تعداد خاصی ہے۔ ڈیڑھ سو کے قریب۔ کچھ ادیب اور شاعر بھی اُردو ایم۔اے میں داخل ہو گئے ہیں۔ ماحول اچھا ہے۔ پڑھنے لکھنے کی فضا ہے۔ آپ یہاں اب اطمینان سے رہیئے اور کام کیجیئے۔ یہاں آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی"۔

مجھے وقار صاحب کی باتوں سے بڑا اطمینان نصیب ہوا۔ اُن کی اِن باتوں میں شفقت اور محبت

Marfat.com

کی چاندنی چھٹکی ہوئی نظر آئی، اور یوں محسوس ہوا جیسے تقسیم ہند کے زمانے میں جو کاری زخم لگے تھے، اُن پر کسی نے مرہم رکھ دیا ہے، اور وہ زخم مندمل ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

اب میں زیادہ وقت وقار صاحب ہی کے ساتھ اُن کے کمرے میں گذارتا تھا۔ یہاں ڈاکٹر محمد باقر اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب اور شہر کے کچھ دوسرے ادیب بھی آجاتے تھے۔ اُن کی باتوں میں اچھا وقت گذر جاتا تھا۔ وقار صاحب کی میز پر کاغذات بکھرے رہتے تھے، چائے کا دور چلتا رہتا تھا، باتیں ہوتی رہتی تھیں اور وقار صاحب اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے، کبھی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں، کبھی کوئی رسالہ اُن کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس کے مطالعے میں مصروف ہیں۔ کبھی کچھ لکھ رہے ہیں، کبھی کوئی طالب علم آگیا تو اُس کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ غرض وقار صاحب کے کام کبھی رُکتے نہیں تھے۔ میں نے ایسی یکسوئی کسی اور شخص میں نہیں دیکھی۔

وقار صاحب نے اسی زمانے میں نیا مکان سمن آباد میں لے لیا تھا، اور اس کو بڑے سلیقے سے سجایا تھا۔ اُن کے مکان پر بھی ملنے والوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ میں بھی اکثر شام کو اُن کے پاس چلا جاتا تھا۔ وقار صاحب گھر پر آنے والوں سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اطلاع ملتے ہی فوراً باہر آجاتے تھے۔ مصافحہ کرتے اور گلے لگاتے تھے، اور آنے والوں کا پُرتپاک استقبال کر کے ڈرائنگ روم میں لے جاتے تھے جہاں وقار صاحب کے ساتھ، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ڈرائنگ روم کی ہر چیز اُن کا خیر مقدم کر رہی ہے۔ وقار صاحب نے اپنے اس کمرے کو اس طرح سجایا تھا کہ اس کی ہر چیز یہاں آنے والوں کو دعوتِ نظارہ دیتی تھی، اور ان لوگوں کے لئے وقار صاحب کی دلکش و دلآویز شخصیت سے مُلاقات اور اُن کے اس کمرے کی ہر چیز کا حسن و جمال ایک عجب طرح کا تفریحی تجربہ ہوتا تھا۔ وقار صاحب بڑی محبت سے انہیں بٹھاتے تھے۔ اُن سے دیر تک دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ پھر چائے منگواتے تھے۔ اس کا دور چلتا تھا۔ چائے کے ساتھ مزے دار کھانے کی چیزیں بھی ہوتی تھیں۔ پھر چاندی کا خاصدان آجاتا تھا جس میں لکھنوی انداز کی پان کی گلوریاں ملنے والوں کو پیش کی جاتی تھیں۔ یہ لوگ ان پانوں سے شوق کرتے تھے، اور اپنے آپ کو سرفراز محسوس کرتے تھے۔

وقار صاحب کا مکان ایسا کچھ زیادہ کُشادہ نہیں تھا لیکن اس مکان میں نہایت خوبصورت

Marfat.com

لان تھا اور اس لان میں دو تین نہایت حسین درخت تھے۔ برآمدے میں چند کرسیاں پڑی رہتی تھیں، اور چھوٹی سی گول میز پر تازہ پھولوں کا ایک گلدستہ رکھا رہتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں دو صوفے اور ایک تخت مشرق و مغرب کے امتزاج کا احساس دلاتا تھا۔ تخت پر گاؤ تکیے ضرور ہوتے تھے، اور رنگ رنگ کے خوبصورت قالین فرش پر اپنی بہار دکھاتے تھے۔ صفائی کا یہ عالم تھا کہ ہر چیز چمکتی ہوئی نظر آتی تھی۔

مجھے تو اکثر وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں بلا لیتے تھے۔ وہاں ایک تخت تھا جس پر وقار صاحب بیٹھ کر کام کرتے تھے اور چاروں طرف کتابوں کی الماریاں تھیں۔ کاغذات اور فائلیں تخت پر بکھری رہتی تھیں، اور وقار صاحب باتیں بھی کرتے جاتے تھے، اور کام بھی جاری رہتا تھا۔ اُن کے بچے بھی آجاتے تھے، کوئی اُن کے پاس بیٹھتا تھا۔ کوئی میری گود میں آجاتا تھا، کوئی وقار صاحب کی گود میں بیٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ وقار صاحب اُن کی طرف بھی متوجہ ہوتے تھے۔ لیکن اس عالم میں بھی اُن کا کام نہیں رُکتا تھا۔ قلم چلتا رہتا تھا۔

میں نے ایک دن اُن سے پوچھا "بچوں اور ملاقاتیوں کی وجہ سے آپ کا دھیان تو نہیں بٹتا؟"

کہنے لگے "اب اس کی عادت سی ہوگئی ہے۔ آدمی کو عادت ہو جائے تو پھر کوئی چیز اس کے کام میں رُکاوٹ پیدا نہیں کرتی۔ میں اسی طرح کام کرتا رہتا ہوں۔ بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سنجیدہ کام میں بچے اور ملنے والے سہارا بنتے ہیں۔ ان کی وجہ سے کسل دور ہو جاتا ہے۔ تھکن ختم ہو جاتی ہے، اور کام کچھ دیر رُکنے اور دم لینے کے بعد رواں دواں ہو جاتا ہے۔

میں نے کسی اور لکھنے والے کو اس طرح کام کرتے ہوئے نہیں دیکھا جس طرح وقار صاحب کرتے تھے۔ اُن کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں ہوتا تھا۔ وہ ان تھک کام کرنے والے تھے۔ اُن کے اندر قدرت نے ہر حال میں لکھتے رہنے کی عجیب و غریب صلاحیت پیدا کر دی تھی، اور وقار صاحب اس سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھاتے تھے۔ انہوں نے گذشتہ نصف صدی میں ہزارہا صفحات لکھے، اور اُن کی اِن تحریروں سے اُردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا۔

پروفیسر وقار عظیم صاحب ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ اُن کی تحریر میں بڑی بے ساختگی اور شادابی تھی۔ وہ الفاظ کو نگینوں کی طرح جڑنے میں مہارت رکھتے تھے، اور اس طرح گُل و گلزار

Marfat.com

کھلانے اور رنگ و نور کے دریا بہانے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ اُن کی تحریر نہایت سادہ اور پُرکار تھی اس میں ایک تہذیب کا عکس نمایاں نظر آتا تھا اس میں میدانوں میں بہتے ہوئے دریا کی سی روانی تھی۔ اس میں ایک ساحرانہ انداز تھا جو پڑھنے والے کے حواس پر چھا جاتا تھا، اور اس میں اُس کو ایک ایسی لذت ملتی تھی جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے وقار صاحب کی شگفتہ و شاداب تحریروں سے بہت کچھ سیکھا، اور انہوں نے جو راستہ بنایا تھا، اس پر حتی الامکان چلنے کی کوشش کی۔ یہ اور بات ہے کہ میری تحریروں میں عشر عشیر بھی وہ بات پیدا نہ ہو سکی جس سے اُن کی تحریر پہچانی جاتی ہے، یعنی شگفتگی اور شادابی اور الفاظ کو نگینوں کی طرح جڑنے والی کیفیت جو نثر کو بھی شاعری کے قالب میں ڈھال دیتی ہے۔

وقار صاحب بہت بڑے محقق، نقاد اور ادیب تھے۔ انہوں نے اُردو داستانوں پر تحقیق کی، اور تقریباً تمام اہم داستانوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا۔ اس لحاظ سے اُن کی کتاب "ہماری داستانیں" تحقیق و تنقید کا ایک شاہکار ہے۔ انہوں نے افسانے پر تحقیقی اور تنقیدی کام کیا، اور اس اعتبار سے اُن کی کتابیں افسانہ نگاری، ہمارے افسانے اور جدید افسانہ فن افسانہ نویسی پر اصولی اور عملی تنقید کی ایسی کتابیں ہیں جو منفرد حیثیت رکھتی ہیں، اور جن سے افسانے سے دلچسپی رکھنے والے ہمیشہ ہمیشہ استفادہ کرتے رہیں گے۔ انہوں نے قدیم و جدید اُردو شعراء پر ایسے مقالات لکھے ہیں جن سے اُردو شاعری کی مزاج دانی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ انہوں نے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین پر اعلےٰ درجے کا تحقیقی کام کیا ہے جو اُردو ادب میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے ریڈیو پر بے شمار تقریریں کی ہیں، تبصرے لکھے ہیں، فیچر تحریر کیے ہیں جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، اِن تحریروں سے اسلامیان ہند کی سیاست، معاشرت، تہذیب اور ادب و شعر کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

غرض وقار صاحب بہت بڑے لکھنے والے تھے، اُنہوں نے اپنی تحریروں سے اُردو زبان و ادب کے ان گنت پہلوؤں کی جس طرح نقاب کُشائی کی ہے، اور ادبی روایت کے خلاؤں کو جس طرح پُر کیا ہے، اُس میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔ ایک محقق، نقاد، ادیب اور انشا پرداز کی حیثیت سے اُن کا نام اُردو کی ادبی تاریخ کے افق پر ہمیشہ ہمیشہ ایک درخشندہ ستارے کی طرح جگمگاتا رہے گا۔

وقار صاحب محقق، نقاد اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے انسان دوستی اُن

Marfat.com

کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔اُن کی ادبی مصروفیات کبھی اُن کی اِن راہوں میں حائل نہیں ہوئیں وہ ایک نرم دل انسان، ایک ذمہ دار شوہر، ایک محبت کرنے والے باپ، ایک شفیق اُستاد، ایک مخلص دوست اور ایک ایسے بزرگ تھے جن کی حیثیت صحیح معنوں میں ایک شجر سایہ دار کی تھی۔

وہ ہر ایک کا دل ہاتھ میں لیتے تھے، کسی کو تکلیف اور پریشانی میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لوگوں کی مدد کرنے میں اُن کا جواب نہیں تھا۔لوگوں سے پوچھتے رہتے تھے "کوئی ضرورت مند آپ کی نظر میں ہے"؟ جس ضرورت مند کا علم ہو جاتا، اُس کی مختلف طریقوں سے مدد کرتے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ پڑھنے لکھنے والوں کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔کسی کی مالی امداد کر دی، کسی کو نوکری دلا دی، کسی کو کاروبار کروا دیا، کسی کا کوئی کام آپڑا تو اُس کی سفارش کر دی۔طالب علمی کے زمانے میں بھی جب خود اُن کی آمدنی ایسی کچھ زیادہ نہیں تھی، وہ اپنے ساتھیوں کی اس طرح مدد کرتے تھے کہ اُس کو کوئی علمی کام دلا دیتے تھے جس سے اس کی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی، اور جب وہ برسرِ روزگار ہو گئے، اور جب اُن کی آمدنی خاصی ہو گئی تو وہ اس کا اچھا خاصا حصّہ ایسے لوگوں پر صَرف کر دیتے تھے جو کوئی علمی ادبی کام کرنا چاہتے تھے۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے "عبادت صاحب! میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔کوئی ایسا آدمی تلاش کیجیے جو صحیح معنوں میں ضرورت مند ہو"۔

میں نے کہا میرے پاس تو صرف طالب علم ہیں جن کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔نام بتایا تو وہ رقم اس کو بُلا کر دے دی۔شرط یہ لگائی کہ وہ محنت سے کام کرے اور اچھا نتیجہ دکھائے۔ ہر سال خدا جانے کتنے طالب علموں کی وہ مدد کرتے تھے۔اس کے علاوہ بعض طالب علموں کی وہ فیسیں دیتے تھے۔ضروری کتابیں اور کاپیاں اُن کے لئے خرید کر بھجواتے تھے۔تھیسز ٹائپ ہوتے تھے تو اس کی اُجرت وہ ادا کرتے تھے۔غرض وقار صاحب کی وجہ سے کسی کا کام رُکتا نہیں تھا۔

اور پھر طالب علموں کو زندگی میں سیٹل settle کرنے کے لئے بھی وہ نہ جانے کیا کیا جتن کرتے تھے۔لڑکیوں کے لئے رشتے تک تلاش کرتے تھے۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے "شام کو میرے ساتھ چلئے۔ایک مسئلہ آپڑا ہے۔آپ میرے ساتھ ہوں تو اچھا ہے" میں شام کو اُن کے ہاں پہنچا۔

Marfat.com

کہنے لگے "ایک شاگرد لڑکی کے گھر جانا ہے۔ اُس کی شادی کا مسئلہ ہے۔ اُس کے ماں باپ صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں"۔

میں اُن کے ساتھ ہو لیا۔ اور ہم لوگ اُن کی پُرانی موٹر میں کوئی گھنٹہ بھر سفر کر کے اُس لڑکی کے گھر پہنچے۔ اُس کے والدین ہمارے منتظر تھے۔ وقار صاحب نے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ وہاں صَرف کیا، اور اپنی صائب رائے کچھ اس طرح دی کہ اُس کے ماں باپ مان گئے۔ انہوں نے ہماری تجویز کو قبول کر لیا، اور اس طرح وہ مسئلہ بخیر و خوبی حل ہو گیا۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے "آج ایک عجب واقعہ ہوا۔ آپ کی اور میری ایک شاگرد لڑکی میرے پاس آئی اور اُس نے زار و قطار رونا شروع کیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اُس نے ایک خط نکال کر مجھے دیا، یہ خط ایک معمر شخص کا تھا، لیکن اُس نے یہ لکھا تھا کہ تم بہت خوبصورت ہو، تمہارے بال بالکل ریشم کی طرح ہیں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارا پرستار ہوں"۔

میں نے ازراہ تفنن کہا "ہم لوگ اس معاملے میں کیا کر سکتے ہیں؟ یہ تو دل کا معاملہ ہے"۔

وقار صاحب کہنے لگے "بات تو صحیح ہے۔ لیکن یہ لڑکی بہت پریشان ہے۔ اس معاملے کو کسی طرح ختم ہونا چاہیئے"

میں چُپ رہا۔

دو تین دن کے بعد وقار صاحب نے کہا "شام کو اس لڑکی کے گھر جانا ہے۔ اس کو تسلی دینا ہے۔ اُس کے ماں باپ کو بھی سمجھانا ہے۔ اِن دو تین دنوں میں کچھ اور واقعات بھی رونما ہوئے ہیں"۔

کیا آپ شام کو میرے ساتھ چلیں گے"؟

میں نے کہا "میں حاضر ہوں"۔

شام کو میں وقار صاحب کے ہاں پہنچا، اور ہم لوگ اس لڑکی کے گھر گئے۔ اس لڑکی کو تسلی دی۔ اُس کے ماں باپ کو بھی اعتماد میں لیا، اُن کو بھی سمجھایا، اور وقار صاحب کے تدبر نے اس بیماری کے لئے ایک ایسا علاج تجویز کیا جس سے اُس معمر شخص کا نشہ ہرن ہو گیا۔

یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن وقار صاحب اِن باتوں کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ وہ اپنے ہر طالب علم کے ذاتی معاملات و مسائل تک کو حل کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ

Marfat.com

ہر طالب علم انہیں، اپنا مُربّی، رہنما اور باپ خیال کرتا تھا، اور اُن کی شفقت اور محبت کے سائے میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتا تھا۔

واقعی وقار صاحب صحیح معنوں میں ایک ایسے عظیم اُستاد تھے جو اپنے طالب علموں کی شخصیت اور کردار کو بنانا اور سنوارنا اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔

وقار صاحب صحیح معنوں میں ایک ایسے عظیم اُستاد تھے جو اپنے طالب علموں کی شخصیت اور کردار کو بنانا اور سنوارنا اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔

وقار صاحب بڑی محنت سے پڑھاتے تھے۔ اُن کا ہر لکچر علم کا ایک خزانہ ہوتا تھا جس کو وہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے میں طالب علموں کے سینوں میں اُتار دیتے تھے، اور انہیں اس کے بعد اس خاص موضوع کے بارے میں کسی کتاب کو پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی تھی۔ وقار صاحب بڑی محنت سے اپنا ہر لکچر تیار کرتے تھے، اور ضروری حوالوں کے ساتھ اپنے خیالات طالب علموں تک پہنچاتے تھے۔ انہوں نے تقریباً چالیس سال تک اورینٹل کالج میں علامہ اقبالؒ اور اُردو ناول اور افسانے پر بلا مبالغہ ہزاروں کی تعداد میں لکچر دیئے اور علم و ادب کے ایسے دریا بہائے جن سے آج بھی طالب علم اپنی علمی کھیتوں کی آبیاری کرتے ہیں۔ اقبالؒ اُردو فکشن اور اُردو نثر پر جو گراں قدر مقالات انہوں نے لکھے ہیں اور جو کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں، اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے بڑے عالم اور کیسے عظیم اُستاد تھے۔

ادب وقار صاحب کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ شب و روز وہ ادبی کاموں میں مصروف رہتے تھے لیکن گھریلو زندگی کو چلانے میں بھی وہ بڑی باقاعدگی سے اپنا کردار ادا کرتے تھے۔ اپنی بیگم صاحبہ اور بچوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ بیگم کی طبیعت کبھی ناساز ہوتی تو وہ باورچی خانے تک کو سنبھال لیتے تھے۔ گھر کی دیکھ بھال میں پوری طرح حصّہ لیتے تھے۔ صبح کو جب وہ گھر سے نکلتے تو اُن کے ساتھ گھریلو کاموں کی ایک فہرست ہوتی تھی جس میں بیگم کے لئے پان، پھل اور مٹھائی اور بچوں کے لئے کتابیں، کاپیاں، کپڑے اور کھلونے تک خریدنے کی تفصیل درج ہوتی تھی۔ اپنی منصبی مصروفیات سے فارغ ہو کر وہ بازار جاتے تھے، اور صبح کو بنائی ہوئی فہرست کے مطابق سارے کام کر کے لدے پھندے دوپہر کو گھر پہنچتے تھے۔ سب گھر والوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ پھر تھوڑی دیر

Marfat.com

آرام کرتے تھے۔چار بجے چائے کی ایک پیالی پی کر اپنا علمی ادبی کام شروع کر دیتے تھے۔مغرب کے وقت تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔سہ پہر کو ملنے والے بھی آجاتے تھے۔اُن سے باتیں کرتے اور اُن کے مسائل بھی حل کرتے تھے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وقار صاحب کی زندگی نظم و ضبط سے بھرپور اور بڑی ہی باقاعدہ تھی۔وہ مشین کی طرح کام کرتے تھے۔میں نے کبھی اُن کو بیکار بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا۔

پروفیسر وقار عظیم صاحب ایک عظیم تہذیبی روایت کے علم بردار اور بڑے ہی مہذب اور شائستہ انسان تھے۔ان کا اخلاق بہت بلند تھا۔وضع داری اُن کی شخصیت کا زیور تھی۔انہوں نے زندگی بھر اپنی وضع نہیں بدلی۔کبھی مغربی لباس نہیں پہنا۔ہمیشہ علی گڑھ کٹ کی شیروانی اور پاجامے میں نظر آئے، اور شیروانی کے بٹن گرمیوں میں بھی بند رکھتے تھے۔اُن کی اس وضع میں کبھی فرق نہیں آیا۔وہ بڑے ہی باذوق انسان تھے، اور حسن و جمال کی مشرقی روایت گویا اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔اس کا اثر اُن کے لباس میں بھی نظر آتا تھا، اور اُن کے گھر میں بھی۔وہ زیادہ تر تخت یا فرش پر بیٹھ کر کام کرتے تھے۔مغربی انداز میں میز کرسی پر بیٹھ کر کام نہیں کرتے تھے۔مہمان نوازی میں اُن کا جواب نہیں تھا۔کوئی اجنبی بھی اُن کے پاس آتا تو اُس کی بھی چائے سے تواضع کی جاتی تھی۔اپنے بچوں کی انہوں نے ایسی تربیت کی تھی کہ وہ تہذیبی اعتبار سے اُن کا نقش ثانی معلوم ہوتے تھے۔آج تک وہ سب کے سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔

وقار صاحب کی شخصیت ایک چشمۂ شیریں تھی، اور اسی وجہ سے مردم و مرغ و مور اُن کے گرد آتے تھے۔وہ اِن میں سے ہر ایک سے نہایت تپاک سے ملتے تھے، اور جو ضرورت مند اُن کے پاس آتے تھے، اُن کی ضروریات پوری کر دیتے تھے۔کوئی اُن کے پاس سے مایوس اور ناکام واپس نہیں جاتا تھا۔ادیبوں اور شاعروں کا تو اُن کے ہاں جمگھٹا رہتا تھا، اور وہ اِن سب کی مختلف طریقوں سے ہمت افزائی کرتے تھے۔ادب و شعر کی محفلیں اُن کا روزانہ کا معمول تھا۔اُن کا گھر ادب و شعر کا مرکز تھا۔کبھی مشاعرہ ہو رہا ہے، کبھی کوئی مضمون پڑھا جا رہا ہے، کبھی افسانے کی محفل منعقد کی جا رہی ہے، کبھی ادبی مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے۔وقار صاحب ہمیشہ اس میں پیش پیش رہتے تھے۔یہی اُن کی تفریح تھی۔

Marfat.com

ہم سب کے لئے وقار صاحب ایک شفیق بزرگ، ایک مخلص دوست، ایک عظیم رہنما، ایک بے مثال مدبر اور ایک بے نظیر استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُن کے ہوتے ہوئے ہم لوگوں کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہم پر سایہ کئے ہوئے ہیں، اور ہم سب اُن کی عظیم شخصیت کے سائے میں محفوظ و مسرور ہیں۔

انہیں روشنی کا ایک مینار اور ایک شجر سایہ دار کہا جائے تو بے جا نہیں!

Marfat.com

Marfat.com

پروفیسر سیّد وزیر الحسن عابدی

میں ۱۹۴۲ء میں اینگلو عربک کالج دہلی سے بہ حیثیت صدر شعبۂ اُردو وابستہ ہوا۔

یہ کالج دِلّی کے مسلمانوں کا واحد کالج تھا جس کو اینگلو عربک سوسائٹی چلاتی تھی۔ اس کے سرپرست قائدِاعظم محمد علی جناح صدر قائدِ ملت لیاقت علی خاں، اور نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب تھے۔ دہلی یونیورسٹی کی انتظامی تحویل میں ہونے کے باوجود اس میں ماحول اسلامی تھا۔ اور اس کے اُستاد اور طالب علم سب کے سب مسلم لیگ کے جاں باز سپاہی تھے۔ یہاں کم و بیش وہی ماحول تھا جس سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پہچانی جاتی تھی۔

اینگلو عربک سوسائٹی کالج کے علاوہ دلّی میں کئی اسکول بھی چلاتی تھی۔ ایک اسکول اجمیری دروازے کے باہر کالج کی قدیم عمارت میں بھی تھا۔ اس اسکول میں فارسی کے ایک اُستاد سید وزیر الحسن عابدی صاحب تھے۔ ایک شفیق اُستاد اور فارسی اور اُردو زبان و ادب کے عالم کی حیثیت سے اُن کی بڑی شہرت تھی۔ ہر شخص دلّی میں اُن کی عزّت کرتا تھا اور علمی استفادے کے لئے دور دور سے لوگ اُن کے پاس آتے تھے۔ غالب سے انہیں گہری دلچسپی تھی، اور اُن کے پاس اس عظیم شاعر سے متعلق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کا ایک بیش بہا خزانہ تھا۔

اس زمانے میں عابدی صاحب لڑکوں کو پڑھاتے تھے، اور اس کے بعد فارسی اور اُردو کے نادر و نایاب قلمی اور قدیم مطبوعہ نسخوں کی تلاش میں دِلّی کے گلی کوچوں کی خاک چھانتے تھے۔ شروع میں اُن سے میری مُلاقات نہ ہو سکی۔ اس زمانے میں وہ اپنی مختلف اور متنوع مصروفیات کے باعث

Marfat.com

ذرا مشکل سے ہاتھ آتے تھے۔

میں انہیں دور سے دیکھا کرتا تھا۔ ہر وقت رواں دواں، بے چین، مضطرب، کبھی کلاس میں، کبھی دفتر میں، کبھی لان میں کبھی کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے۔ کبھی لائبریری میں ایک عالم اضطراب میں مطالعے میں مصروف، کبھی طالب علموں سے نہایت مشفقانہ انداز میں باتیں کرتے ہوئے۔ کبھی نہایت شائستہ انداز میں اساتذہ سے محو کلام۔ کبھی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اسکول سے باہر جاتے ہوئے۔

لمبا قد، چھ فٹ سے کچھ زیادہ، دُبلے پتلے، چہرے پر خشخاشی داڑھی جسم پر گھٹنوں سے نیچے تک لمبی شیروانی، جس کے بٹن اوپر تک بند، بڑے پائنچوں کا پاجامہ، سر پر سیاہ رنگ کی مخمل کی ٹوپی، چہرے پر سنہرے رنگ کی ہلکے سے فریم کی عینک، حد درجہ نستعلیق، مجموعی طور پر تہذیب و شائستگی کا مجسمہ! ——

یہ تھے سید وزیر الحسن عابدی!

چند مہینے بعد جب میری اُن سے ایک دن مُلاقات ہوئی تو وہ مجھے علم کا ایک بحر ذخار معلوم ہوئے ادبی ذوق ایسا صاف ستھرا اور پاکیزہ گویا کوثر و تسنیم میں دُھلا ہوا۔ گل افشانی گفتار کا یہ عالم کہ اُن کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات شہد و شکر میں ڈوبی ہوئی نظر آئی۔ چنانچہ پہلی ہی ملاقات میں اُن سے میری دوستی ہوگئی۔

عابدی صاحب نے اسی زمانے میں دہلی یونیورسٹی سے فارسی میں ام۔اے کر لیا تھا، اور سینٹ اسٹیفنز کالج میں فارسی کے پروفیسر ڈاکٹر سید اظہر علی کی زیر نگرانی غالب پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے تھے۔ غالب کا میں بھی شیدائی تھا۔ اسی لئے میں اُن سے بہت قریب ہوگیا، اور علمی استفادے کی غرض سے ملاقاتیں بھی خاصی ہونے لگیں۔

ایک سال بھی نہیں گذرا تھا کہ اینگلو عربک کالج کے فارسی کے ایک پروفیسر حکومت ہند میں ایران کی تہذیب و ثقافت کے ایک ماہر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے لئے دو سال کی رخصت پر چلے گئے تو میں نے اس موقع کو غنیمت جانا، اور کوشش کر کے اُن کی جگہ پر فارسی کے اُستاد کی حیثیت سے عابدی صاحب کا تقرر کروالیا۔ اس طرح عابدی صاحب اینگلو عربک کالج میں آگئے اور ہمارے رفیق کار کی حیثیت سے تدریس و تحقیق کی خدمات انجام دینے لگے۔ اُردو کے شعبے میں اس

Marfat.com

وقت میں تنہا اُستاد تھا، اس لئے میں نے اُردو زبان وادب پڑھانے کا کچھ کام عابدی صاحب کے سُپرد کر دیا۔ عابدی صاحب نے اُردو شاعری پر کچھ ایسے دلنشین انداز میں لکچر دینے شروع کئے کہ طالب علموں کو مسحور کر دیا، اب ان کے جوہر کھُلے، اور سارے شہر میں اُن کے علم اور خوش بیانی کا چرچا ہونے لگا۔ طالب علم سارے شہر میں اُن کے انداز تدریس کی تعریفیں کرنے لگے، اور عابدی صاحب کا فارسی کے ساتھ اُردو زبان وادب کے بھی نامور استادوں میں شمار ہونے لگا،

لیکن عابدی صاحب زیادہ عرصے ہمارے ساتھ نہ رہ سکے۔ قیام پاکستان سے ایک سال قبل ہی انہیں حکومت ایران کی طرف سے فارسی زبان وادب میں تہران یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرنے کے لئے وظیفہ مل گیا، اور وہ دِلّی کو چھوڑ کر تہران چلے گئے، اور نہایت انہماک کے ساتھ وہاں علمی کام کرنے لگے۔

اس عرصے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ عابدی صاحب وطن سے دور تھے۔ اس لئے اُس آشوب قیامت سے تو محفوظ رہے جس سے ہم لوگوں کو دِلّی میں دوچار ہونا پڑا، اور ایسے ایسے مناظر دیکھنے پڑے جن کے خیال سے آج بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

عابدی صاحب بڑے کٹّر پاکستانی تھے۔ اس لئے قیام پاکستان کے فوراً بعد اُنہوں نے تہران میں اپنے پاکستانی ہونے کا اعلان کیا، اور ہندوستانی پاسپورٹ کو خیرباد کہہ کر پاکستانی پاسپورٹ حاصل کر لیا۔ اور ایران میں پاکستان کا کام کرنے لگے۔ اس زمانے میں انہوں نے ایران میں پاکستان کے بارے میں لکچر دیئے اور ایران کے بڑے بڑے عالموں، ادیبوں اور شاعروں سے رابطہ قائم کر کے نظریۂ پاکستان کی وضاحت کی، اور اِن سب کو پاکستان کا بہی خواہ بنا لیا۔ ہندوستان کے سفارت خانے نے اپنی سی پوری کوشش کی کہ ایرانی دانشوروں کے دلوں میں ہندوستانی نظریات جاگزیں ہو جائیں لیکن اُن کی دال نہیں گلی، اور عابدی صاحب نے ہندوستان کی ایسی تمام کوششوں کو خاک میں ملا دیا۔ یہ اُن کا بہت بڑا کارنامہ تھا، اور پاکستان کی ایسی خدمت تھی جو بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر وقت کا ایک اہم تقاضا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد عابدی صاحب ایران میں کوئی پانچ چھ سال رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے قومی وملّی کام کے ساتھ ساتھ اپنی ڈاکٹریٹ کے لئے کام کیا، اور وہ تمام امتحان پاس

Marfat.com

کرنے جو ڈاکٹریٹ کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ لیکن ۱۹۵۱ء میں انہیں پاکستان واپس آنا پڑا۔

ہوا یوں کہ اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے رحمٰن صاحب مرحوم خیر سگالی کے مشن پر تہران گئے۔ وہاں اُن کی مُلاقات عابدی صاحب سے ہوئی اور وہ ایران میں اُن کے کام اور شہرت و ناموری سے بہت متاثر ہوئے۔ ایرانی پروفیسر، دانشور، ادیب، شاعر، علمائے دین اور صحافی جن سے بھی رحمٰن صاحب کی ملاقات ہوئی تو اُن میں سے ہر ایک نے عابدی صاحب کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا۔ بلکہ بعضوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ ایرانیوں سے بہتر فارسی بولتے ہیں، اور ایرانی پروفیسروں سے زیادہ گہری نظر فارسی کے کلاسیکی اور جدید ادبیات پر رکھتے ہیں۔ لاہور واپس آکر رحمٰن صاحب نے کئی محفلوں میں اس کا ذکر کیا، اور یہ بھی بتایا کہ جن ایرانی دانشوروں نے عابدی صاحب کے بارے میں یہ باتیں کیں، وہ معمولی لوگ نہیں تھے، ایران میں اُن کی دھوم تھی، اور ہر شخص اُن کی عزت کرتا تھا۔ اِن میں ملک الشعراء بہار، پروفیسر فروزاں فر پروفیسر آقائے مجتبیٰ مینوی، پروفیسر آقائے سعید نفیسی، پروفیسر آقائے سیاسی، پروفیسر مہدی محقق، پروفیسر دکتر اسلامی، پروفیسر مظاہر مُصفا، آقائے صورت گر، اور اسی طرح کے بہت سے مشہور لوگ تھے۔ عابدی صاحب سے ایران میں رحمٰن صاحب کی کئی ملاقاتیں ہوئیں، اور وہ اُن کے علم و فضل اور فارسی بولنے کے انداز سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے اُنہوں نے عابدی صاحب کو پنجاب یونیورسٹی میں فارسی کے اُستاد کی حیثیت سے آنے کی دعوت دے دی۔

پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں اُس وقت بولنے والی فارسی (Reader in Spoken Iranian) کی ایک ریڈرشپ تھی۔ اس جگہ پر قیام پاکستان کے بعد ڈاکٹر شوستری کو دو سال کے کنٹریکٹ پر بُلا لیا گیا تھا۔ شوستری صاحب کئی سال ہوئے ریٹائر ہو چکے تھے اور اس سے قبل اورینٹل کالج میں خاصے عرصے تک کام کر چکے تھے۔ اُن کا قیام اس زمانے میں میسور میں تھا۔ وہ اپنے خاندان والوں کو میسور میں چھوڑ کر تنہا اس جگہ پر کام کرنے کے لئے لاہور آ تو گئے تھے لیکن تنہائی کی وجہ سے کچھ پریشان سے رہتے تھے۔ بہرحال کچھ عرصے وہ اس جگہ پر کام کرتے رہے لیکن تنہائی سے پریشان ہو کر واپس اپنے گھر میسور واپس چلے گئے۔

Marfat.com

شوستری صاحب کے جانے کے بعد یونیورسٹی نے اس پوسٹ کا اشتہار دے دیا۔ کچھ درخواستیں بھی آئیں لیکن ان میں جدید فارسی کا کوئی معقول اسکالر نہیں تھا۔ اس لئے تقرر نہیں کیا گیا۔ رحمٰن صاحب کو وائس چانسلر کی حیثیت سے اس صورتِ حال کا علم تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایران کے دوران قیام میں یہ پوسٹ عابدی صاحب کو آفر کر دی۔ عابدی صاحب نے پہلے تو معذرت کی، کیونکہ وہ اپنی ڈاکٹریٹ کو مکمل کرنا چاہتے تھے لیکن جب انہیں تہران یونیورسٹی سے یہ اجازت مل گئی کہ وہ لاہور میں رہ کر اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کر کے پیش کر سکتے ہیں تو انہوں نے وائس چانسلر کے اس آفر کو قبول کر لیا، ڈاکٹریٹ کے لئے تہران یونیورسٹی میں جو امتحانات ہوتے ہیں، وہ عابدی صاحب پاس کر ہی چکے تھے۔ صرف تھیسز پیش کرنا تھا۔ اُن کے اساتذہ نے اس کی اجازت دے دی، اور انہوں نے رحمٰن صاحب کے کہنے پر لاہور آنے کا فیصلہ کر لیا، اورینٹل کالج میں فارسی کے ریڈر کی حیثیت سے لاہور پہنچ گئے اور تدریس کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

یہ تقرر چونکہ وائس چانسلر صاحب نے کیا تھا، اس لئے شعبۂ فارسی اور اورینٹل کالج میں کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ صدر شعبۂ فارسی کو یہ بات ناگوار گذری لیکن وائس چانسلر کے فیصلے سے کوئی شخص اختلاف کیسے کر سکتا تھا۔ بہرحال عابدی صاحب شعبے میں آگئے، اور انہوں نے بہت تھوڑے عرصے میں اپنی قابلیت سے اساتذہ اور طلباء میں بڑی مقبولیت حاصل کر لی اور اُن کے دل جیت لئے۔

لیکن اورینٹل کالج میں اندر ہی اندر در پردہ اُن کی مخالفت کا ایک طوفان موج زن ہونے لگا، اور اُن پر طرح طرح کے الزامات لگائے جانے لگے۔ مثلاً یہ کہ اُن کے پاس ڈگریاں نہیں ہیں، انہیں جدید فارسی نہیں آتی۔ وہ کلاس نہیں لیتے۔ پڑھا نہیں سکتے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ سب باتیں غلط اور بے بُنیاد تھیں، اور ان کا مقصد یہ تھا کہ جب ایک تعلیمی سال کے بعد اُن کے کنفرمیشن کا معاملہ زیرِ غور آئے تو انہیں کنفرم نہ کیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ سال گذرا تو صدر شعبہ نے اُن کے بارے میں رپورٹ لکھتے وقت صاف صاف یونیورسٹی کو لکھ دیا کہ ان کو کنفرم نہ کیا جائے اور فوراً ملازمت سے سبک دوش کر دیا جائے لیکن وائس چانسلر رحمٰن صاحب اور اورینٹل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر برکت علی قریشی نے ایسا نہیں ہونے دیا، اور بعد از خرابیٔ بسیار عابدی صاحب کنفرم

Marfat.com

کر دیئے گئے۔ وائس چانسلر اور سنڈیکیٹ نے حالات کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا۔ صدر شعبہ کو بھی اس فیصلے کو مجبوراً تسلیم کرنا پڑا۔ لیکن شعبے میں ایک تناؤ اور ہیجان کی کیفیت اس وقت تک باقی رہی جب تک عابدی صاحب اپنی ملازمت کی مدت پوری کر کے ریٹائر نہیں ہو گئے تقریباً پچیس سال انہوں نے اس مسموم فضا میں گذارے، اور اس فضا نے انہیں دیوانگی کی حد تک پہنچا دیا۔ اس زمانے میں صرف اُن کی علمی قابلیت اُن کی تہذیب و شائستگی اور ان تھک محنت نے انہیں زندہ رکھا لیکن وہ ہمیشہ پریشان رہے۔

شاید ہی کوئی اُستاد، عالم، ادیب اور دانشور کسی تعلیمی ادارے میں ایسے المیے سے دوچار ہوا ہو۔ جس کا عابدی صاحب کو سامنا کرنا پڑا۔ عابدی صاحب زندگی بھر اس المیے سے دوچار رہے۔ غم کھاتے رہے اور کام کرتے رہے۔ لیکن کام کرنے کی جو مسرت ہوتی ہے وہ اُنہیں نصیب نہیں ہوئی۔ اُن کے شعبے کے رفقاء زندگی بھر اُن کے دشمن رہے۔ صرف اُن کے طالب علم اُن پر جان چھڑکتے رہے۔ کیونکہ بقول اِن طالب علموں کے عابدی صاحب کے پڑھانے کا انداز ایسا تھا کہ طالب علم اُن کے لیکچروں میں مسحور ہو جاتے تھے۔ جب وہ پڑھاتے تھے تو علم کا ایک سمندر موج زن ہوتا تھا اور شہد و شکر کی ندیاں بہتی تھیں۔ لیکچروں کے بعد بھی وہ طالب علموں کو خاصا وقت دیتے تھے اور علم کے خزانے طالب علموں کے سینوں میں منتقل کر دیتے تھے۔ اس زمانے میں ام۔ اے کے طالب علموں کے ساتھ ساتھ انہوں نے پی ایچ ڈی کے اسکالروں کی ایک کھیپ بھی پیدا کی، جنہوں نے اُن کی نگرانی میں تحقیق کا کام کیا، اور انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں ملیں۔ عابدی صاحب کے اِن شاگردوں نے ادب کی دُنیا میں بھی نام پیدا کیا، اور اُن کی نگرانی میں ان شاگردوں نے فارسی ادب سے متعلق کئی ایسے کام کئے جن کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی۔

عابدی صاحب نے اس زمانے میں ناسازگار حالات کے باوجود، تدریس کے ساتھ ساتھ قابل قدر تحقیقی کام بھی کیا۔ فارسی لسانیات و صوتیات پر اُن کے کئی تحقیقی مقالے شائع ہوئے۔ حافظ سعدی اور خسروؒ پر بھی انہوں نے کئی کتابیں نہایت اہتمام سے شائع کیں۔ غالب پر بھی بعض ایسے تحقیقی کام کئے جن کو نئی ادبی دریافت کے زُمرے میں شامل کیا گیا، اور ان کاموں کو نہ صرف پاکستان ہندوستان اور ایران میں بلکہ مغربی ممالک میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا،

Marfat.com

اوراِن کاموں کی بدولت عابدی صاحب کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔

اس زمانے میں عابدی صاحب پر جو کچھ بیت رہی تھی، اس کے باوجود اس طرح کے تحقیقی اور علمی کام کرنا ایک معجزے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ایسی مخالفت جیسی کہ عابدی صاحب کی ہوئی، اُس میں انسان علمی کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ اس عالم میں ایک حساس انسان کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے، اور ڈر، خوف اور ایک غیر یقینی کی کیفیت اس پر اس طرح سوار ہو جاتی ہے کہ اعتماد کھو بیٹھتا ہے۔ عابدی صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ اسی کیفیت کا شکار ہوئے، اور اُن کے مزاج میں ایک طرح کا چڑچڑاپن پیدا ہوا۔

عابدی صاحب اس زمانے میں ہر ایک کو اپنا دشمن سمجھنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ میرے ایسے مربّی انسان پر بھی وہ شبہ کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ اُن کے دشمنوں سے بھی میرے تعلقات خوشگوار تھے۔ جو کچھ ان پر بیت رہی تھی، اُس کا مجھے پوری طرح علم بھی نہیں تھا۔ کیونکہ ہر چیز پردۂ راز میں رکھی جاتی تھی۔ البتہ اتنا مجھے ضرور علم تھا کہ وہ پریشان رہتے ہیں لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ میں اُس وقت اُن کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ایسے میں سوائے اُن کی دلدہی کے میں اُن کی کیا مدد کرتا؟

ایک دن عابدی صاحب مجھ سے کہنے لگے "آپ بھی میرے دشمنوں سے مِلے ہوئے ہیں۔ مجھے آپ پر بھی بھروسہ نہیں"۔

میں نے کہا "عابدی صاحب! میں آپ کی بڑی عزّت کرتا ہوں، اور میری کوشش یہ ہے کہ کسی طرح یہ ناخوشگوار فضا ختم ہو۔ لیکن میں کچھ کر نہیں سکتا۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اتنی اونچی سطح پر ہو رہا ہے کہ وہاں تک میری رسائی ممکن نہیں۔ ویسے میں اُستادوں کے درمیان اس فضا کو بہت بُرا سمجھتا ہوں۔ لیکن مجھے تفصیلات کا علم نہیں۔ آپ مجھ پر شبہ نہ کیجیے"۔

زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ عابدی صاحب کو میرے مُثبت رویّے کا یقین ہو گیا، اور جب انہیں اس حقیقت کا علم ہوا کہ کنفرمیشن کے معاملے میں ڈاکٹر برکت علی قریشی اور ڈاکٹر عبداللہ نے اُن کی جو مدد کی، اُس میں میرا بھی کچھ حصّہ تھا، تو وہ مطمئن ہو گئے اور اُنہوں نے میرے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات کو ہموار رکھا، اور یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ عابدی صاحب

Marfat.com

مجھے اپنا دوست سمجھتے ہیں۔

عابدی صاحب تقریباً پچیس۲۵ سال اورینٹل کالج میں رہے۔ افسوس ہے کہ وہ ریڈر کی حیثیت سے آئے اور پچیس۲۵ سال بعد ریڈر ہی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ یونیورسٹی کی تاریخ میں شاید ہی کسی قابل اُستاد کے ساتھ ایسا ستم ہوا ہو، ورنہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جو شخص لکچراری سے ملازمت کا آغاز کرتا ہے، وہ بھی پروفیسری تک پہنچ کر ریٹائر ہوتا ہے۔ لیکن پروفیسری عابدی صاحب کی قسمت میں نہیں تھی۔ حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ انہیں پروفیسر ہونا چاہیئے تھا۔ وہ اس کے اہل تھے۔ لیکن اُن کے مخالفین نے انہیں پروفیسر نہیں ہونے دیا۔ سازشوں کا ایک جال بچھا ہوا تھا جس سے باہر نکلنے اور نبرد آزما ہونے کی اُن میں صلاحیت نہیں تھی۔ وہ نہایت سادہ اور معصوم انسان تھے جیسے کہ ایک اُستاد، عالم اور دانشور کو ہونا چاہیئے۔ اس سلسلے میں بہت سی باتیں ناگفتنی ہیں۔

پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ عابدی صاحب کے لئے کسی قدر سکون اور اطمینان کا زمانہ تھا۔ اس لئے کہ خاں صاحب اُن کے علم و دانش کے پرستار تھے، اور اُن کی بہت قدر کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ عابدی صاحب کے پائے کا فارسی داں اور عالم اور محقق اس وقت پاکستان اور ہندوستان میں کوئی نہیں۔

میں اُن کی وائس چانسلری کے زمانے میں اُردو کا پروفیسر، شعبۂ اُردو کا صدر، اور اورینٹل کالج کا پرنسپل ہوگیا۔ اس لئے وہ مجھے اکثر اپنے پاس بُلا کر یہ کہتے تھے کہ عابدی کا خیال رکھیئے، یہ بہت بڑے عالم ہیں۔ اِن سے کام لیجیئے یہ زمانے کے زخم خوردہ ہیں۔ ان کے زخموں پر مرہم رکھیئے۔ بعض لوگوں نے اِن کو بہت ستایا ہے، اور خواہ مخواہ ستایا ہے۔ ان کا دل طرزِ ناپاک اہلِ دنیا کو دیکھ کر جل چکا ہے، اور اب یہ افسردگی کی آرزو کے سہارے جیتے ہیں۔ ہمارے ہاں جس کو دیکھئے وہ علامہ بن جاتا ہے۔ صحیح علامہ تو یہ ہیں۔ یہ صرف فارسی زبان و ادب ہی کے عالم اور محقق نہیں ہیں، تمام علوم انسانی پر ان کی گہری نظر ہے۔ ادبیات، الٰہیات، تاریخ، فلسفہ، نفسیات، جمالیات، منطق، فقہ، حدیث عابدی صاحب اِن تمام علوم کے ماہر ہیں۔ ایسے آدمی کی قدر کرنی چاہیئے۔ علامہ تو ہمارے ہاں بہت ہیں لیکن یہ صحیح معنوں میں علامہ ہیں۔ اسی لئے میں یونیورسٹی کے دفتر کی فائلوں میں میں ہمیشہ

Marfat.com

اُن کے نام کے ساتھ عُلامہ کا لفظ لکھتا ہوں۔ انہیں یہ لفظ زیب دیتا ہے"۔

خاں صاحب کی یہ باتیں سُن کر میں اکثر عابدی صاحب کو ٹٹولتا تھا تو وہ مختلف علوم پر ایسی باتیں کرتے تھے کہ اُن کو سُن کر حیرت ہوتی تھی اور یہ شخص مجھے علم کا ایک بحرِ ذخار نظر آتا تھا۔

اس زمانے میں عابدی صاحب مرحوم نے غالب کی دو نادر و نایاب کتابیں "باغ دودر" اور "گُل رعنا" دریافت کر کے مع مفصّل حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کیں جن کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی۔ یہ کتابیں مطالعۂ غالب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر غالب کی فارسی کتابوں کو بڑی محنت اور جاں فشانی سے اس طرح مرتب کیا کہ ان کو ایک عام فارسی داں بھی آسانی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ اِن میں غزلیاتِ فارسی، پنج آہنگ، افادات غالب (لطائف غیبی، سوالات عبدالکریم) سبدِ چین خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ تمام کتابیں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، اور عابدی صاحب سے یہ عظیم تحقیقی کام کروانے کا سہرا پروفیسر حمید احمد خاں صاحب وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے سر ہے۔ جب تک غالب زندہ ہے عابدی صاحب مرحوم کا یہ تحقیقی کام بھی زندہ رہے گا۔ اور خود عابدی صاحب بھی زندہ رہیں گے۔

عابدی صاحب کا بہت سا کام ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے مزاج میں احتیاط کا خیال بہت تھا۔ جب تک وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہو جاتے تھے اپنا کوئی کام اشاعت کے لئے نہیں دیتے تھے۔ اِن کاموں کی تفصیلات کا علم عابدی صاحب کے عزیز شاگرد ڈاکٹر میاں بشیر حسین صاحب علی ہجویری پروفیسری اورینٹل کالج کو سب سے زیادہ تھا۔ وہ عابدی صاحب کے انتقال کے بعد بلڈ کینسر کے موذی مرض میں مُبتلا ہوئے اور دو سال بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ اب صرف عابدی صاحب کے ایک اور شاگرد رشید ڈاکٹر آفتاب اصغر، ایسوسیٹ پروفیسر فارسی اورینٹل کالج کو اِن کاموں کا علم ہے۔ وہ انشاء اللہ ضرور ان کاموں کی ترتیب اور طباعت و اشاعت کی طرف توجہ کریں گے۔

عابدی صاحب مرحوم ۱۹۷۴ء میں اپنی مُدّت ملازمت پوری کر کے اورینٹل کالج سے ریٹائر ہو گئے تقریباً پچیس چھبیس ۲۶ سال اُنہوں نے اورینٹل کالج میں ریڈر ان اسپوکن ایرانین کی حیثیت

Marfat.com

سے گذارے۔ بغیر درخواست کے ریڈر کی حیثیت سے آئے تھے اور ربع صدی سے زیادہ تدریس وتحقیق کی خدمات انجام دے کر ریڈر ہی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

ریٹائرمنٹ کے وقت اُن کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ چنانچہ اُنہوں نے ملازمت میں توسیع کے لئے درخواست دی لیکن اُن کے ایک رفیق کار نے اُس پر یہ لکھا کہ عابدی صاحب پی ایچ ڈی نہیں ہیں۔ اس لئے انہیں توسیع نہیں ملنی چاہیئے۔ حالانکہ انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران اپنے بیسوں شاگردوں کو پی ایچ ڈی کروایا۔ جب یونیورسٹی کا اُستاد تدریس وتحقیق کی ان منزلوں سے ہم کنار ہو جائے جن سے عابدی صاحب ہم کنار ہو گئے تھے تو وہ پی ایچ ڈی کرتا نہیں، اپنے شاگردوں کو پی ایچ ڈی کرواتا ہے۔ خود اورینٹل کالج میں اس کی مثالیں موجود تھیں۔ پروفیسر سید وقار عظیم صاحب خود پی ایچ ڈی نہیں تھے لیکن انہوں نے بے شمار شاگردوں کو پی ایچ ڈی کروایا اور خود پروفیسر بھی ہو گئے۔ علی گڑھ میں خواجہ منظور حسین صاحب، رشید احمد صدیقی صاحب اور آل احمد سرور صاحب بھی پی ایچ ڈی نہیں تھے۔ لکھنؤ میں تو پروفیسر سدھانت، مسعود حسن رضوی صاحب اور احتشام حسین صاحب بھی ایسے ہی پروفیسر تھے۔

عابدی صاحب کے بارے میں یہ نوٹ پڑھ کر بہ حیثیت پرنسپل اورینٹل کالج اور ڈین اورینٹل اینڈ اسلامک لرننگ مجھے بہت صدمہ ہوا، اور میں نے اس پر ایک طویل نوٹ عابدی صاحب کے تدریسی اور تحقیقی کام کے بارے میں لکھا لیکن آس پاس سازشوں کا بازار گرم تھا۔ اس لئے میرے نوٹ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ شاید ہی یونیورسٹی کی تاریخ میں کبھی ایسا ہوا ہو کہ پرنسپل ڈین اور چانسلر کے مشیر نے کسی ریٹائر ہونے والے اُستاد کے لئے ملازمت میں توسیع کی سفارش کی ہو، لیکن اِس کو توسیع نہ ملی ہو۔ دو سال کی توسیع ان کو مل جاتی تو کون سی قیامت آجاتی۔ خاص طور پر اس درخواست کے پیشِ نظر جو عابدی صاحب مرحوم نے اس سلسلے میں پیش کی تھی۔ اس کا لہجہ اور انداز بیان ایسا تھا کہ ظالم سے ظالم اور سفاک سے سفاک انسان بھی اس کو دیکھ کر پگھل جاتا۔ میں ریکارڈ کے طور پر اس درخواست کو یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

Marfat.com

بخدمت شریف جناب وائس چانسلر صاحب، پنجاب یونیورسٹی
بہ وساطت افسران متعلقہ، صدر محترم شعبۂ فارسی،
پرنسپل صاحب اورینٹل کالج، محترم ڈین فیکلٹی آف اورینٹل اینڈ اسلامک لرننگ۔

جناب والہ

احترامات کے ساتھ معروض خدمت ہے۔

اس خدمت گذار کی مدّت ملازمت بربنائے شعبت سالگی، اس سال ۳۰ ستمبر ۱۹۷۳ کو ختم ہو رہی ہے۔

موجودہ اقتصادی صورتِ حال اور سقیم مالی حالت کی بنا پر، جناب سے ملتمس ہوں کہ یکم اکتوبر ۱۹۷۳ء سے اس خدمت گذار کو، ازراہِ علم پروری، نئے معاہدۂ ملازمت کے ذریعے آئندہ دو سال کے لئے بدستور ملازم رہنے کے احکام صادر فرمادیں تاکہ تدریس کی خدمات کے ساتھ اپنے اُن تحقیقی کاموں کی بھی بہ سکون و اطمینان تکمیل کرسکوں جو بہت پہلے سے جاری ہیں۔

یہ درخواست یونیورسٹی اورینٹل کالج اور یونیورسٹی کے بعض دوسرے شعبوں کے محترم رفقائے کار اور بہت سے سابق اور موجودہ طلبا کے ایما اور اصرار، اور شہر کے بعض ممتاز بزرگان علم و ادب کی ہمّت افزائی کے سہارے، جو اس حقیر کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں، آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جُرأت کر رہا ہوں۔

سالہا سال سے اس حقیر کا تاثر یہ رہا ہے کہ اس خدمت گذار کے علمی انہماک اور طالب علموں کی پُرمشقّت اور خدمت کے بارے میں جناب کی رائے بھی اچھی رہی ہے۔

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۲۴ ستمبر ۱۹۷۲ء

تجدید احترامات فائقہ کے ساتھ
ادنےٰ خدمت گذار
(سیّد وزیر الحسن عابدی)
ایسوسی ایٹ پروفیسرانِ اسپوکن ایرانین
پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

اس درخواست کو پڑھ کر پتھر بھی ہوتا تو پگھل جاتا۔ لیکن کچھ لوگ اتنے سفّاک اور انسانیت

Marfat.com

سے محروم تھے کہ اُنہوں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا، اور سازشوں کا ایک جال بچھا دیا، مجھے یقین ہے کہ عابدی صاحب کے ایسے سادہ و معصوم اسکالر کے خلاف سازش کرنے کی وجہ سے اُن کی بخشش نہیں ہوگی۔

میں نے بہ حیثیت ایک انسان اور پرنسپل اورنٹیل کالج اور ڈین فیکلٹی آف اورنٹیل اینڈ اسلامک لرننگ اپنے فرض کو پورا کیا، اور اس پر عابدی صاحب کے حق میں ایک مفصل نوٹ لکھا، جس میں عابدی صاحب کے علمی کام کی تعریف کر کے یہ سفارش کی گئی کہ انہیں دو سال کی توسیع دے دی جائے مجھے افسوس ہے کہ یونیورسٹی کے دفتر نے میری اس سفارش کو درخود اعتنا نہ سمجھا، ڈنڈی ماری، اور اس کو اوپر تک پہنچنے ہی نہیں دیا۔

چند روز بعد ڈپٹی رجسٹرار کی طرف سے ایک خط آیا جس میں یہ اطلاع تھی کہ عابدی صاحب کی ملازمت میں توسیع ممکن نہیں ہے۔

مجھے اس کا صدمہ ہوا۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ اُنہیں نقصان پہنچانے کی ایک سازش تھی۔

یونیورسٹی کی ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد عابدی صاحب کو کچھ رقم پراویڈنٹ فنڈ کی ملی جو انہوں نے مکان کی تعمیر پر صرف کر دی اور اس کے بعد مالی اعتبار سے انتہائی تکلیف اور پریشانی میں وقت گذارا۔ اس کی تفصیل لکھنے کی میرے اندر ہمت نہیں، سوچ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ یونیورسٹی کے ارباب اختیار میں سے کسی نے اُن سے یہ نہیں پوچھا کہ گذر بسر کیسے ہوتی ہے؛ برخلاف اس کے بعض لوگوں نے تو انہیں طرح طرح سے اذیتیں پہنچائیں بے حسی، خود غرضی اور بد دیانتی یہی سکھاتی ہے۔ خون سفید ہو جانا اسی کو کہتے ہیں۔

اس صورت حال نے عابدی صاحب کو ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار کر دیا، اور وہ بالکل گوشہ نشین ہو گئے۔ وہ لوگوں پر شبہ کرنے لگے، اور ان سے ڈرنے لگے۔ اس زمانے میں جو لوگ اُن کا حوصلہ بڑھاتے تھے اُن میں اُن کے شاگرد سید علی محتشم صاحب ڈاکٹر میاں بشیر حسین مرحوم اور ڈاکٹر آفتاب اصغر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ احباب میں شیخ طفیل مرحوم اسسٹنٹ کمشنر

Marfat.com

لاہور اور ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور بھی اکثر اُن کے پاس آتے تھے، اور اُن کی دلدہی کرتے تھے۔ میں بھی اکثر اُن کے دولت کدے پر حاضری دیتا تھا، اور میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ عابدی صاحب کا غم کسی طرح غلط ہو، اُن میں زندہ رہنے کی خواہش پیدا ہو تاکہ وہ علمی کاموں میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرسکیں۔ نہ جانے کیا کیا جتن اس سلسلے میں میں نے کئے۔ بہت سی باتیں تو ناگفتنی ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مجھے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ ادبیات کا عارضی طور پر اعزازی ڈائرکٹر بنا دیا گیا تھا تاکہ میں اُس کی دیکھ بھال کرسکوں۔ یونیورسٹی کے ارباب اختیار میں سے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ شعبۂ تاریخ ادبیات کا کام مکمل ہوچکا ہے۔ اس لئے اس کو بند کردینا چاہیئے۔ چنانچہ ریسرچ اسکالرز کی ملازمتیں ختم کردی گئی تھیں اور اُنہیں ملازمت سے برطرفی کے نوٹس مل گئے تھے۔ اس شعبے کا چارج لینے کے بعد میں نے یہ سوچا کہ اس شعبے کو بند نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ آئندہ بھی اس میں اچھا خاصا تحقیقی کام ہوسکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے لئے کوشش کی۔ وفاقی حکومت کی گرانٹ بحال کروائی، اور یونیورسٹی کے ارباب اختیار کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ یونیورسٹی کا اس شعبے پر ایک پیسہ صرف نہیں ہوگا۔ ہم اس کو وفاقی حکومت کی ریسرچ گرانٹ سے چلائیں گے۔ یونیورسٹی کے ملازم جو اس شعبے میں کام کرتے ہیں، اُن کی تنخواہیں بھی دیں گے اور تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کی ۱۵ اشاعت شدہ جلدوں کا اشاریہ تیار کروائیں گے۔ یہ تجویز منظور ہوگئی، اور یہ شعبہ زندہ رہا۔ ڈاکٹر عبدالغنی اس شعبے میں ریسرچ اسکالر تھے۔ وہ ادارۂ معارف اسلامیہ میں چلے گئے۔ اُن کی خالی جگہ پر میں نے عابدی صاحب کا تقرر کرلیا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ وائس چانسلر صاحب میری اس تجویز سے اتفاق نہیں کریں گے کیونکہ اُن کا رویہ منفی تھا۔ اس لئے میں نے اس وقت کے روسی سفیر عظیموف کی ایک دعوت میں، اُن کے سامنے تاریخ ادبیات کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے وائس چانسلر سے اس تقرر کی منظوری لے لی۔ دوسرے دن میں عابدی صاحب کے پاس گیا پہلے تو عابدی صاحب اس کے لئے تیار نہیں ہوئے لیکن جب میں نے بہت زور دیا، اور اُن سے یہ کہا کہ میں خود آپ کو گھر سے اپنی گاڑی میں یونیورسٹی لے جایا کروں گا اور واپس بھی پہنچا دیا کروں گا تو وہ راضی ہوگئے۔ اور انہوں نے

Marfat.com

شعبے میں کام شروع کر دیا، انڈکس تیار کرنے میں انہوں نے ہماری بڑی مدد کی، اور چند سال میں اس کی پانچ جلدیں تیار ہوگئیں مقدمہ بھی انہوں نے تیار کر دیا۔ یہ بڑا اہم کام تھا۔ عابدی صاحب کی مدد اور رہنمائی کے بغیر اس کی تکمیل ممکن نہ تھی۔

عابدی صاحب کے شعبے میں آجانے کی وجہ سے خاصا علمی ماحول پیدا ہوا، اور وہ ریسرچ اسکالر جو اس سے قبل ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کے عادی تھے، وہ بھی اُن کی نگرانی میں کام کرنے لگے۔

کئی سال تک میں صبح کو یونیورسٹی جانے سے قبل عابدی صاحب کے مکان پر حاضری دیتا تھا۔ انہیں اپنی موٹر میں بٹھاتا تھا، اور یونیورسٹی لے جاتا تھا۔

جب وہ موٹر میں بیٹھ جاتے تو میں اُن سے پوچھتا "حضرت مزاج کیسا ہے"؟

وہ کہتے "الحمدللہ! اچھا ہوں"!

میں کہتا "خُدا کا شکر ہے کہ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ کام کم کیجیے۔ غذا کا خیال رکھیے"۔

اس پر وہ ہمیشہ کہتے "ڈاکٹر صاحب! معقول غذا کے لئے مناسب وسائل کی ضرورت ہے۔ خس خانہ وَبرفاب کہاں سے لاؤں"؟ یہ بات سُن کر میں خاموش ہو جاتا۔ کرتا بھی کیا؟

لیکن یہ سب کچھ سُن کر یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے میرے سینے پر برچھی چلائی ہے۔

میں یہ سوچتا کہ اہلِ علم کا اس زمانے میں کیا حال ہوا ہے۔ اُن کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اُن سے کوئی کام لینے والا نہیں۔ اُن کی صلاحیتوں سے کوئی فائدہ اُٹھانے والا نہیں۔ اس معاشرے میں کس قدر سفاکی ہے۔ اللہ تعالےٰ اپنا رحم کرے!

عابدی صاحب اس زمانے میں ہر وقت قرآنی آیات کی تلاوت کرتے تھے۔ اُن کے پاس ایک تھیلا تھا۔ اس میں قرآنی آیات رکھتے، اور موٹر میں میرے برابر کی سیٹ پر آگے ہو کر بیٹھتے، ٹیک نہیں لگاتے تھے۔

میں اُن سے کہتا "حضرت! آپ اطمینان سے ٹیک لگا کر، پوری سیٹ پر آرام سے بیٹھئے۔ میں جانتا ہوں، آپ کو تکلیف نہ ہو"۔

وہ کہتے "میرے تھیلے میں قرآنی آیات ہیں۔ احترام کے خیال سے آگے ہو کر بیٹھتا ہوں۔

Marfat.com

مجھے اس طرح آرام ملتا ہے، اور سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے"۔

یہ باتیں کرتے ہوئے ہم لوگ یونیورسٹی پہنچتے۔ میں عابدی صاحب کو تاریخ ادبیات کے دفتر میں چھوڑتا، اور پھر اورینٹل کالج چلا جاتا۔ واپسی اسی طرح دو بجے کے قریب ہوتی۔ عابدی صاحب کو اُن کے گھر پہنچاتا، اور پھر نیو کیمپس اپنی جائے قیام پر چلا جاتا۔

کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا، اور مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ میں نے ایک عالم کی خدمت کی اور اس کو جس حد تک ممکن ہو سکا آرام پہنچایا۔

شعبۂ تاریخ ادبیات میں عابدی صاحب کے آجانے کے بعد میں نے وائس چانسلر صاحب کو ایک نوٹ لکھا جس میں یہ سفارش کی کہ عابدی صاحب کی شخصیت اور اُن کے علمی کام کے بلند معیار کے پیش نظر، اُن کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا جائے۔ ایسا کرنے سے یونیورسٹی کا کوئی مالی نقصان نہیں ہوگا، کیونکہ ہم ریسرچ کے اس شعبے کو وفاقی حکومت پاکستان کی گرانٹ سے چلا رہے ہیں، اور یونیورسٹی کی طرف سے جو عملہ شعبے کو ملا ہے، اس کی تنخواہیں بھی اسی گرانٹ سے دیتے ہیں۔ لیکن خیرات صاحب نے ٹکا سا جواب دے دیا، اور میرے اس نوٹ پر یہ لکھا کہ اب تو یونیورسٹی اس شعبے کو بند کر رہی ہے، عابدی صاحب کی تنخواہ نہیں بڑھائی جا سکتی۔

مجھے اس کا صدمہ ہوا۔ کیونکہ خیرات صاحب سازشوں میں گھرے ہوئے تھے، اور بعض لوگوں کے کہنے پر ہر حال میں شعبے کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب کسی شعبے پر یونیورسٹی کا کوئی پیسہ خرچ نہیں ہو رہا ہے اور وہ صرف وفاقی حکومت کی گرانٹ سے ادبی تحقیق کا قابل قدر کام کر رہا ہے تو اس کے بند کرنے کا کیا جواز تھا۔ خیرات صاحب عجیب و غریب آدمی تھے۔

جب میں نے اس وقت کے وفاقی سیکرٹری تعلیمات ڈاکٹر ممتاز علی قاضی سے اس کا ذکر کیا تو وہ حیران رہ گئے، اور کہنے لگے کہ "ہم تو آپ کی یونیورسٹی کو ریسرچ کے لئے گرانٹ دینا چاہتے ہیں لیکن اس کے ارباب اختیار اس کے لئے تیار نہیں۔ شاید ہی کسی یونیورسٹی نے کبھی ایسا منفی رویہ اختیار کیا ہو"۔

اس پر میں نے کہا جناب! ہماری یونیورسٹی کو اب تحقیق کے کام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ لوگ

Marfat.com

تواب اِن کاموں کو خیر باد کہہ رہے ہیں۔ یونیورسٹی تواب سازشوں کا اکھاڑہ ہے اور وائس چانسلر صاحب چند لوگوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ انہیں تواب ہر وقت اپنی ملازمت کو بچانے کی فکر رہتی ہے علم سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں"۔

قاضی صاحب میری یہ باتیں سُن کر دیر تک مجھ سے اظہار افسوس کرتے رہے۔

بہرحال میں عابدی صاحب کی تنخواہ میں اضافہ نہ کروا سکا۔ لیکن قاضی صاحب کی مدد سے میں اس شعبے کو کسی اور صورت میں زندہ رکھنے میں کامیاب ہوا، اور الحمدللہ کہ یہ شعبہ آج بھی زندہ ہے، اور اس میں قابل قدر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ گذشتہ چند سال میں اس شعبے نے کوئی تیس۳۰ کتابیں شائع کر دی ہیں جن کی اشاعت سے اُردو ادب کی تاریخ کے خلا پُر ہوئے ہیں، اور اس کام کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی ہے۔

غرض عابدی صاحب میری وجہ سے نہایت معمولی تنخواہ پر کئی سال تک اس شعبے میں کام کرتے رہے، اور اُن کے کام سے شعبے کو بہت فائدہ ہوا۔ انہوں نے اس زمانے میں نہ صرف علمی کاموں میں میری مدد کی، بلکہ علالت کے باوجود شعبے کی نمائندگی کرنے کے لئے بیرون ملک بھی گئے، اور وہاں انہوں نے پاکستان اور پنجاب یونیورسٹی کا نام روشن کیا۔

اس سلسلے میں اُن کا سب سے اہم سفر افغانستان کا سفر تھا۔ ۱۹۷۶ء میں انہوں نے کابل میں ہونے والے بیدل بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کی، اور بیدل اور غالب پر اپنا گراں قدر مقالہ فارسی زبان میں پڑھا۔ اُن کی شرکت کا اثر پاکستان اور افغانستان کے سیاسی اور ثقافتی تعلقات پر بھی بہت اچھا ہوا۔

کابل سے واپس آکر انہوں نے ایک مُفصّل رپورٹ لکھی، اور ذاتی طور پر مجھے بتایا کہ اس موقع پر اُن کی مُلاقات نور محمد ترکئی صاحب سے بھی ہوئی جو اُس زمانے میں جیل میں تھے لیکن بیدل سیمینار میں شرکت کے لئے جن کو حکومت افغانستان نے عارضی طور پر رہا کیا تھا۔

عابدی صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ کابل یونیورسٹی کی لائبریری میں بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ نادر و نایاب کتابوں کے مطالعے میں مصروف تھے کہ ایک صاحب نہایت خوش شکل اور وجیہہ، میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ "میرا نام نور محمد ترکئی ہے۔ میں آج کل جیل میں ہوں

Marfat.com

لیکن بیدل سمینار کے لئے مجھے عارضی طور پر رہا کیا گیا ہے میں اپنا زیادہ وقت کتب خانے میں گزارتا ہوں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق ہے۔ اس موقع کو غنیمت جانا۔ دن بھر یہیں رہتا ہوں۔ آپ سے غائبانہ تعارف ہے۔ جی چاہا آپ سے مل لوں۔ میرے لئے دعا کیجئے۔"

عابدی صاحب نے اُن سے کہا کہ "آپ تو ماشاءاللہ افغانستان کی مشہور و معروف شخصیت ہیں آپ کو کون نہیں جانتا! آپ سے نیاز حاصل کر کے بے حد خوشی ہوئی۔ میں آپ کے لئے دعا کرتا رہوں گا۔ اللہ تعالےٰ آپ کو اور آپ کے وطن کو اپنی امان میں رکھے!"

نور محمد ترکئی صاحب سے اپنی مُلاقات کی یہ تفصیل عابدی صاحب نے مجھے سُنائی، اور مجھے ان کی باتوں سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ نور محمد ترکئی صاحب دین دار آدمی تھے، اور دعا پر یقین رکھتے تھے، اور پاکستان کے بھی بہی خواہ تھے۔

غرض عابدی صاحب جہاں بھی جاتے تھے براہ راست یا بالواسطہ طور پر پاکستان کے لئے کام کرتے تھے، اور سیاست دانوں، عالموں اور ادیبوں کے دلوں میں پاکستان کی محبت کا چراغ روشن کرتے تھے۔ ایران کے دوران قیام میں بھی انہوں نے یہ کام کیا، عراق میں بھی اُنہوں نے یہ خدمت انجام دی۔ افغانستان میں بھی انہوں نے یہ کام کیا، اور مشرق وسطےٰ کے دوسرے ملکوں میں بھی پاکستان کی محبت کے جذبے کی جوت جگانے کو اپنا فرض اولین سمجھا۔

افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے ہم وطنوں نے ایسے شخص کی قدر نہیں کی، اور اس سے کوئی کام نہیں لیا۔ انہیں تو اِن ملکوں میں سے کسی ایک میں پاکستان کا سفیر ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ہمارے ہاں تو سفیر عام طور پر ایسے لوگ بنائے جاتے ہیں جو علم و ادب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ انہیں تو صرف دفتری کام آتا ہے۔

عابدی صاحب مرحوم نے اپنی بیشتر زندگی عُسرت میں گذاری۔ زندگی بھر وہ علمی کاموں میں مصروف رہے۔ پڑھتے لکھتے رہے، اور نادر و نایاب کتابیں جمع کرتے رہے۔ اُن کے پاس ہزاروں کی تعداد میں نادر قلمی نسخے اور نایاب مطبوعہ کتابیں تھیں جو کسی بڑی سے بڑی لائبریری میں مشکل سے دستیاب ہو سکیں گی لیکن ناسازگار مالی حالات سے پریشان ہو کر وہ بعض ایسے قلمی نسخوں کو فروخت کرنے کے لئے بھی مجبور ہوئے جو انہیں جان سے زیادہ عزیز تھے۔ لاکھوں

Marfat.com

روپے بھی جن پر نثار تھے لیکن جن کے لئے چند ہزار روپے سے زیادہ انھوں نے طلب نہیں کئے مشہور شاعر ہلالی کا دیوان، اُس کے ہاتھ کا لکھا ہوا، اُن کی ملکیت تھا۔ اس کو انہوں نے صرف پانچ ہزار روپے میں اسلام آباد کے کسی ادارے کو دے دیا۔ یہ بات جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن مرحوم نے مجھے بتائی، اور افسوس کا اظہار کیا کہ جس نسخے کی قیمت پانچ لاکھ ہونی چاہیئے تھی، اُس کے انھوں نے صرف پانچ ہزار قبول کئے۔ رحمٰن صاحب کے بقول عابدی صاحب بہت معصوم اور بھولے آدمی تھے۔ دنیا داری انہیں نہیں آتی تھی۔ اگر عابدی صاحب خود پانچ ہزار کی رقم طلب نہ کرتے تو میں (یعنی رحمٰن صاحب) اس قیمتی نسخے کی کئی ہزار گنا زیادہ رقم دلا دیتا۔ لیکن چونکہ انہوں نے خود پانچ ہزار کی رقم مانگی تھی۔ اس لئے میں مجبور ہو گیا۔

پنجاب یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا نے ۲۰ جون ۱۹۷۹ء کو پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ ادبیات پر شب خون مارا۔ شعبے کو بند کر دیا اور عابدی صاحب پھر بیکار ہو گئے۔ اسی روز اُن کا انتقال ہو گیا۔ وہ اس سانحے کو برداشت نہ کر سکے۔

عابدی صاحب کے انتقال کے بعد اُن کے اہل و عیال پر جو کچھ گذری، وہ ایک بڑی ہی المناک داستان ہے اور اس کی تفصیل بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس کے خیال ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اُن کی بیگم صاحبہ نے اس کی تفصیل میری اہلیہ کے سامنے بیان کی۔ میں خود اس کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

اُن کی اہلیہ بیگم امتہ الرضا صاحبہ نہایت مخلص اور دور اندیش خاتون تھیں۔ انہوں نے عابدی صاحب کے کتب خانے کو محفوظ کرنے کے لئے اُن کے شاگردوں سے مفصل فہرست تیار کروائی۔ پنجاب یونیورسٹی سے بات کی لیکن وہاں سے یہی جواب ملا کہ فنڈز نہیں ہیں۔ حالانکہ اس کے لئے رقم یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے حاصل کی جا سکتی تھی۔ لیکن یونیورسٹی کو ان چیزوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس لئے ٹکا سا جواب دے دیا۔ پھر انہوں نے پنجاب آرکائیوز سے رابطہ قائم کیا۔ وہ لوگ اس کو لینے کے لئے تیار ہو گئے لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ انہوں نے بھی صاف انکار کر دیا۔ میں ترکی سے واپس آیا تو انہوں نے اس کی تفصیل مجھے سنائی۔ میں نے سوچا حکیم سعید صاحب سے بات کروں۔ چنانچہ میرے کہنے پر وہ ان نادر و نایاب کتابوں

Marfat.com

کو سوا تین لاکھ میں لینے کے لئے تیار ہو گئے، اور اس طرح یہ نادر و نایاب ذخیرہ کتب، جن میں تین سو زیادہ نادر و نایاب قلمی نسخے بھی تھے، اور کئی ہزار نادر مطبوعہ کتابیں تھیں، ہمدرد یونیورسٹی میں محفوظ ہو گیا۔ پنجاب یونیورسٹی اور لاہور میں رہنے والے سکالرز اس نایاب ذخیرے سے محروم ہو گئے۔ عابدی صاحب کی روح اس پر یقیناً تڑپی ہو گی۔ خیر شکر ہے کہ عابدی صاحب کا کتب خانہ ملک کے ایک اہم ادارے میں محفوظ ہو گیا، اور اُن کے بچوں کو کچھ رقم بھی مل گئی۔

عابدی صاحب کی اہلیہ بھی کوئی دو سال ہوئے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اب اُن کے دونوں بچے ہوسٹل میں رہتے ہیں اور اُن کے مکان کو ایک کمرشل انسٹی ٹیوٹ نے کرائے پر لے لیا ہے۔ اس مکان میں جہاں عابدی صاحب نے تیس سال سے زیادہ عرصہ گذارا تھا، اب وہاں لڑکے کامرس پڑھتے ہیں اور ان کے پھاٹک کے سامنے، اندر اور باہر سائیکلیں اور موٹر سائیکلیں کھڑی رہتی ہیں۔ میرے نزدیک تو یہ بھی ایک المیہ ہے۔ اس مکان میں تو اُن کی یادگار قائم ہونی چاہیئے تھی تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہوتا کہ یہاں ایک بہت بڑا سکالر اور پروفیسر رہتا، کام کرتا، اور علم و حکمت کے موتی لُٹاتا تھا۔

میرے خیال میں عابدی صاحب مرحوم کی زندگی ایک المیہ تھی۔ زندگی میں بھی انہیں سکون نصیب نہ ہو سکا، اور مرنے کے بعد بھی وہ سکون اور اطمینان کی دولت سے ہم کنار نہ ہو سکے۔ اس صورتِ حال پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

جب بھی مجھے عابدی صاحب کا خیال آتا ہے، اور یہ خیال اکثر آتا ہے، تو یہ شعر میری زبان پر مچلنے لگتا ہے، اور ماضی کی المناک یادوں کو بیدار کر کے نہ جانے کیا کیا کچھ کہتا ہے ؎

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے — غالب

Marfat.com

Marfat.com

مولانا نورالحسن خاں

اورینٹل کالج میں دو طرح کے تعلیمی نظام تھے۔ ایک مشرقی، دوسرا مغربی، مشرقی نظام کے تحت یہاں مولوی فاضل، منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحانات کے لئے طالب علموں کو تیار کیا جاتا تھا۔ باقاعدہ کلاسیں ہوتی تھیں، اور ان جماعتوں کو بڑے بڑے عالم فاضل اساتذہ پڑھاتے تھے۔ ان اساتذہ میں مولانا فیض الحسن سہارن پوری، جناب شاداں بلگرامی، حافظ محمود خاں شیرانی کے نام سرفہرست ہیں۔

میں جب اورینٹل کالج میں آیا تو ان بزرگوں کی تدریسی روایت کو جو لوگ قائم رکھے ہوئے تھے ان میں مولانا رسول خاں، مولانا فیوض الرحمٰن، مولانا سید میرک شاہ، مولانا عبدالصمد صارم الازہری اور مولانا نورالحسن خاں صاحب بڑے عالم فاضل بزرگ تھے۔ اورینٹل کالج کے مشرقی نظام میں ان کے دم سے رونق تھی۔ ان کے سائے میں ایسے ایسے لوگوں نے تعلیم حاصل کی جو آگے چل کر علمی ادبی دنیا میں بہت مشہور ہوئے۔ ان میں امتیاز علی خاں عرشی، ڈاکٹر مسعود حسین شادانی ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر محمد باقر وغیرہ نے علمی ادبی دُنیا میں اپنا مقام پیدا کیا، اور برعظیم پاکستان و ہند میں ان کی شہرت کی خوشبو، دور دور تک پھیل گئی۔ ان میں سے بعض مشرق سے مغرب کی طرف چلے گئے اور انہوں نے اس روایت کو قائم کیا جس کو ڈاکٹر لائیٹنر، پروفیسر آرنلڈ، سر آرل اسٹائن، پروفیسر وولز، پروفیسر شفیع اور پروفیسر اقبال وغیرہ نے پروان چڑھایا تھا، اور جس کے تحت ام۔ اے اور پی ایچ ڈی کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔

Marfat.com

مولانا نورالحسن خاں کالج کے مشرقی نظام کے ساتھ تعلق رکھتے تھے، لیکن انہوں نے اپنے علم و فضل کی وجہ سے مغربی نظام کی روایت میں بھی اپنی جگہ بنالی تھی، اور اُن کا شمار بڑے قابل اساتذہ میں ہوتا تھا۔

اورینٹل کالج میں جب اُن سے ملاقات ہوئی تو میں اُنہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ نہ تو مجھے اُن کے چہرے پر دوسرے مشرقی اساتذہ کی طرح داڑھی نظر آئی نہ انہیں مشرقی لباس زیب تن کئے ہوئے دیکھا۔ برخلاف اس کے انہیں فارغ البال، (کلین شیو) اور مغربی لباس میں ملبوس دیکھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ اس لئے مولانا سفید بش شرٹ اور سفید پتلون میں ملبوس تھے۔ اُن کے دُبلے پتلے جسم پر یہ لباس بہت ہی بھلا لگتا تھا۔ مولانا بڑے جامہ زیب تھے۔ اُن کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کی دلکشی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں انسان اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ باتیں کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک سمندر موج زن ہے۔ مزاج میں لطافت اور بذلہ سنجی بھی ایسی تھی جو میں نے کسی دوسرے عالم دین میں ذرا کم ہی دیکھی ہے۔

میں پہلی ہی ملاقات میں اُن کا گرویدہ ہو گیا، اور میری اُن سے دوستی ہو گئی۔

مولانا اُس زمانے میں کالج کے سابق پرنسپل اور سنسکرت کے پروفیسر وولنر صاحب کی عطا کی ہوئی بڑی میز کے ایک حصے پر اسٹاف روم میں کام کرتے ہوئے یا احباب سے باتیں کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ لکچر دینے کے لئے اوپر کی منزل پر جاتے تھے، اور پھر آکر یہیں اسی جگہ پر بیٹھ جاتے تھے۔ ایک بجے تک وہ کالج میں رہتے تھے اس کے بعد گھر واپس چلے جاتے تھے۔ بہت کم لوگوں سے ملتے تھے، اور کسی سے بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔ کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ ذہانت اُن کے مزاج میں بلا کی تھی۔ ہر ایک کو خوب سمجھتے تھے، اور اس کے بارے میں صحیح رائے رکھتے تھے، اور دو ٹوک اس رائے کا اظہار کرتے تھے، لیکن اختصار کے ساتھ، پہلو دار انداز میں۔ خودداری اور عزت نفس اُن کی شخصیت میں ایسی تھی کہ میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔ حساس ایسے تھے کہ مجھے ان سے ڈر لگتا تھا۔

جب میں پہلی بار کالج کے اسٹاف روم میں اُن سے ملا تو چند منٹ میں اُن کے مزاج کی یہ تمام خصوصیات مجھ پر آئینہ ہو گئیں۔ تیس پینتیس سال اُن سے رابطہ رہا لیکن اُن کے مزاج

Marfat.com

کی اِن خصوصیات میں کبھی کوئی فرق نہیں دیکھا۔ مجھ پر اُن کی شفقت اور محبت لازوال تھی۔

اورینٹل کالج کا اسٹاف روم مولانا کے دم سے آباد تھا۔ وہ اپنی ایک مخصوص کُرسی پر بیٹھتے تھے۔ اور ہر وقت مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ میرے دِل میں کبھی کسی اچھے آدمی سے مِلنے کی خواہش بیدار ہوتی اور اورینٹل کالج کے ماحول میں یہ خواہش اکثر بیدار ہوتی تھی۔ تو میں اپنے کمرے سے نکل کر مولانا کے پاس اسٹاف روم میں چلا جاتا تھا، اور دیر تک اُن سے باتیں کر کے اپنے اندر زندگی کی رمق پیدا کرتا تھا۔ مولانا سچے کھرے اور بے باک انسان تھے، اس لئے اُن کی باتیں میرے دل میں شمعیں سی فروزاں کر دیتی تھیں اور میں اپنے آس پاس اور گرد و پیش ایک چراغاں کی سی کیفیت محسوس کرتا تھا۔ مولانا کی ہر بات روشنی کی ایک کرن اور اُن کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ رنگ و نور کی ایک قندیل ہوتا تھا۔

ایک دن مولانا سے اورینٹل کالج کے ماضی اور حال پر باتیں ہو رہی تھیں، اور اس ادارے کے تہذیبی اور تعلیمی تضادات پر گفتگو ہو رہی تھی۔

دورانِ گفتگو میں نے مولانا سے پوچھا "آپ تو ایک زمانے سے اورینٹل کالج میں ہیں۔ یہ تو فرمائیے کہ یہاں بعض اساتذہ مئی، جون اور جولائی کی گرمی میں سوٹ زیبِ تن کیوں کرتے ہیں اور ٹائی کیوں لگاتے ہیں"؟

مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا "عربی کا ایک مشہور شاعر تھا المتنبّی، وہ نوکر رکھتے پہنا کرتا تھا۔ بیچارہ دُبلا اور کمزور بہت تھا۔ اس کمزوری کو چھپانے کے لئے اس کو گرمیوں میں بھی نوکر تے پہننے پڑتے تھے۔ اس کو سامنے رکھیئے تو بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی اور حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی۔ اورینٹل کالج میں کچھ لوگ منحنی اور کمزور بہت ہیں"۔

مولانا کی یہ بات سُن کر میں اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا۔ کیونکہ اُن کی بات بڑی ہی پہلو دار تھی۔ لیکن میں سمجھ گیا کہ اُن کا روئے سخن کس کی طرف ہے۔ میں نے مُسکراہٹوں اور قہقہوں سے اُن کی خوب داد دی، اور دیر تک اُن کی اس بات سے اورینٹل کالج کے اسٹاف روم کی محفل زعفران زار بنی رہی۔

نورالحسن خاں صاحب تھے تو مولوی لیکن اُن کے مزاج میں شگفتگی اور شادابی کا رنگ کچھ

Marfat.com

اس طرح رچا ہوا تھا کہ اُن کی کوئی بات ذہانت سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنی اس ذہانت سے اپنی محدود دنیا میں گُل و گلزار سے کِھلاتے اور پھُلجھڑیاں سی چھوڑتے تھے۔

مولانا اُس زمانے میں سگریٹ بہت پیتے تھے۔ بے تکلف احباب کا مجمع ہو تو سگریٹ پیتے جاتے تھے اور اپنی دلچسپ باتوں سے پھول بکھیرتے جاتے تھے۔ اُن کی باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی جس سے سارا اورینٹل کالج مہکتا تھا، اور وہ مشامِ جاں کو معطر کرتی تھی۔ مولانا بڑے ہی خوش گفتار اور بذلہ سنج انسان تھے۔ لیکن یہ گل افشانی گفتار اور بذلہ سنجی صرف اُن کے احباب کی تعداد محدود تھی۔ گنتی کے دو چار آدمی تھے جن کی صحبت میں وہ خوش ہوتے تھے، اور صرف اُن کے ساتھ وہ دلچسپ باتیں کرتے تھے۔

کالج سے فارغ ہو کر وہ نگینہ بیکری ضرور جاتے تھے۔ یہاں وہ احباب سے مِلتے اور بیکری کی مخصوص چائے پیتے تھے۔ کوئین میری کالج کے پروفیسر ڈاکٹر صابر علی خاں صاحب ایک زمانے میں بیکری کے پاس رہتے تھے، اور آتے جاتے بیکری کا چکر ضرور لگاتے تھے۔ مولانا ہمیشہ اُن کے ساتھ بیٹھتے تھے اور باتیں کرتے تھے۔ وہ اُن کے بڑے ہی مخلص دوست تھے، سنجیدہ آدمی تھے لیکن مولانا اُن سے بے تکلف ہو کر باتیں کرتے تھے۔ ملک اسلم بھی اکثر اُن کے پاس بیٹھتے تھے۔ وہ بھی صابر علی خاں صاحب کی طرح اخلاص کا پیکر تھے۔ کبھی کبھی میں بھی وہاں چلا جاتا تھا، اور مولانا کی اِن دلچسپ صحبتوں سے لُطف اندوز ہوتا تھا۔

نگینہ بیکری بھی خوب جگہ تھی۔ انارکلی کے چوراہے پر ایک معمولی سی پرانے انداز کی دوکان، جس میں چار چھ کرسیاں، دو تین میزیں، دیوار پر ایک مذہبی قسم کا کیلنڈر۔ دوکان میں باہر کی طرف چولہا، اس پر چائے کی کیتلی جس میں ہر وقت پانی اُبلتا ہوا۔ ایک مولوی صاحب دودھ پتی کی کڑک، چائے بناتے اور وضع دار قسم کے چائے پینے والے اس میں چائے پیتے، ایک دو بسکٹ کھاتے، اور گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتے بڑے بڑے ادیب، اور شاعر بھی یہاں آتے تھے۔ ان میں مولانا چراغ حسن حسرت، مولانا صلاح الدین احمد، باری علیگ، ڈاکٹر عبداللہ، اختر شیرانی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا نور الحسن خاں بھی بیکری کے مستقل گاہک تھے۔ دن میں دو دفعہ وہاں ضرور

Marfat.com

جلتے، چائے پیتے اور احباب سے باتیں کرتے۔ اُن کے ساتھ ڈاکٹر صابر علی خاں ضرور ہوتے تھے۔ شام کو میں بھی کبھی کبھی بیکری میں چلا جاتا تھا، اور مولانا کی گل افشانی گفتار سے لُطف اندوز ہوتا تھا۔ مولانا یہاں مغرب کے وقت تک بیٹھتے پھر انارکلی کی مسجد میں درس قُرآن دینے کے لئے چلے جاتے۔ برسوں اُن کے اس درس قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ اور ہزارہا افراد نے اُن کے اس درس قرآن سے استفادہ کیا، انارکلی بازار میں دُور دُور تک وہ ایک بہت بڑے عالم کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اُن کا علم قرآن، وسیع اور ہمہ گیر اور اُن کی خطابت لاجواب تھی۔ انارکلی کے آس پاس کے علاقوں میں اُن کے درسِ قرآن کی دُھوم تھی۔ بڑے بڑے لوگ اس درس میں شریک ہوتے اور مولانا کی خیال انگیز تفسیر قُرآن کی داد دیتے تھے۔

مولانا کی تعلیم مدرسۃ العلوم دیوبند میں ہوئی تھی، اور وہ وہاں کے فاضل تھے۔ قُرآن، حدیث، فقہ، تاریخ اسلام، عربی ادب، فلسفہ، منطق وغیرہ کا مطالعہ انہوں نے دیوبند میں بڑی محنت سے کیا تھا۔ اس عہد کے بڑے بڑے جید علماء کے سامنے انہوں نے زانوئے ادب تہہ کیا تھا، اور ذوق وشوق محنت وجفاکشی، اور ترقی پسندی اور روشن خیالی نے انہیں ایک جید عالم بنا دیا تھا۔ اُن کے افکار وخیالات میں ایک اجتہادی شان تھی جس سے وہ پہچانے جاتے تھے۔

اُنہوں نے اپنی ساری زندگی اورنٹیل کالج میں گذار دی۔ مولوی فاضل اور ام۔ اے عربی کی جماعتوں کو درس دیتے رہے، اور تحقیقی کام کی نگرانی بھی کی۔ اُن کے طالب علم اُن کی بڑی عزت کرتے تھے۔

جب میں ۱۹۷۰ء میں اورنٹیل کالج کا پرنسپل ہوا تو میں نے اُن کے علم اور تجربے کو بنیاد بنا کر یونیورسٹی سے یہ سفارش کی کہ مولانا کی دینی اسناد کو مغربی ڈگریوں کے برابر قرار دے کر انہیں لکچرار اور اسسٹنٹ پروفیسر بنایا جائے۔ کئی کمیٹیوں میں میں نے اُن کی وکالت کی اور اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم سے میری بات مانی گئی، اور انہیں اسسٹنٹ پروفیسر بنا دیا گیا، اور اس فیصلے سے بہت سے دوسرے مشرقی شعبوں کے اساتذہ کا بھی بھلا ہوا۔ مولانا اس

Marfat.com

کامیابی سے بہت خوش ہوئے، اور مجھے اطمینان قلب نصیب ہوا ؎

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

اب مولانا کے علمی اور تعلیمی جوش و خروش میں کچھ اور بھی اضافہ ہوگیا، اور عربی اور اسلامیات کے طالب علم اُن کی پرستش کرنے لگے۔ شعبۂ عربی میں شاید ہی کسی اُستاد کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی ہوگی جیسی کہ مولانا کو حاصل ہوئی۔

مولانا اورنٹیل کالج کی تدریسی روایت کے بہت بڑے علم بردار تھے۔ انہوں نے اپنی ان تھک محنت سے علوم کے خزانے ہزاروں طالب علموں کے سینوں میں اُتار دیئے۔ انہیں علم کی دولت سے مالامال کیا۔ انہیں دین دار بنایا، اور اُن کے اندر انسانی اقدار کی شمعیں فروزاں کیں۔ انہیں روشن خیال بنایا اور اُن کے دلوں میں ولولے اور حوصلے کے ایسے چراغ روشن کئے جن کی روشنی میں اُن کے افکار و خیالات اجتہادی رنگ و آہنگ سے ہم کنار ہوئے۔

میری پرنسپلی کے زمانے میں مولانا نے کالج کے انتظامی معاملات کو صحیح ڈگر پر چلانے میں میرا ہاتھ بٹایا۔ میں نے انہیں وولنر ہاسٹل کا سپرنٹنڈنٹ بنایا، اور انہوں نے اس قدیم ہاسٹل کو ایسے سلیقے سے چلایا جس کی مثال اس کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ طالب علم اُن کی بڑی عزت کرتے تھے، اور اُن کی بات مانتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہاسٹل سیاست کے اکھاڑے بن گئے تھے۔ مولانا کے تدبر نے وولنر ہوسٹل کو سیاست کا اکھاڑہ نہیں بننے دیا۔ اپنی خوشی انتظامی کی وجہ سے بڑی ہی خوشگوار فضا پیدا کی جس کی وجہ سے آگ اور پانی گلے ملتے ہوئے نظر آتے۔ ایسا اتصال اُس زمانے میں کسی دوسرے ادارے میں نہیں دیکھا گیا۔ مختلف اور متضاد خیالات و نظریات سیاسی جماعتیں اس زمانے میں اپنے اپنے پروگراموں کے مطابق طالب علموں کو شیشے میں اُتارتی تھیں، اور اُن سے سیاسی نوعیت کے کام لیتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے نتیجے میں ہنگامے ہوتے تھے۔ مولانا کی بصیرت، شفقت اور محبت نے ان ہنگاموں کو وولنر ہوسٹل اور کالج سے دور رکھنے میں میری بڑی مدد کی۔ طالب علموں کو اپنے بچوں کی طرح حفظ و امان میں رکھا۔ کھانے کا معقول انتظام کیا۔ مولانا طالب علموں کے لئے کم سے کم پیسوں میں خالص

Marfat.com

گھی کا کھانا پکواتے تھے۔حساب کتاب طالب علموں کے ہاتھ میں تھا۔اس لئے وہ مولانا اور کالج کی انتظامیہ سے خوش رہتے تھے۔

اورینٹل کالج میں طالب علموں کے لئے کھیلوں کا بھی انتظام تھا۔لیکن برائے نام تھا، خانہ پُری کے لئے سال میں ایک دفعہ کھیلوں کے مقابلے یونیورسٹی گراؤنڈ میں کرائے جاتے تھے۔لیکن میری پرنسپلی کے زمانے میں مولانا نے کالج کے کھیلوں میں جان ڈالی، اور کئی کلب بنائے جن میں کشتی رانی، والی بال، ہاکی، فٹ بال، بیڈمنٹن وغیرہ کے کھیل کھیلے جانے لگے۔کشتی رانی کے سالانہ جلسے کے موقع پر مولانا دریائے راوی پر بڑا اہتمام کرتے تھے۔کشتی رانی کے مقابلوں کے ساتھ ساتھ اس موقع پر کشتی میں دریا کی سیر کی جاتی تھی۔لذیذ کھانے پکوائے جاتے تھے۔اساتذہ اور طلبا راس میں بڑے ذوق وشوق سے حصّہ لیتے تھے۔دن بھر دریائے راوی پر جشن کا سا سماں رہتا تھا۔

مولانا نورالحسن خاں صاحب بڑے ہی خوددار آدمی تھے۔عزّت نفس کا احساس اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔مولانا اسی احساس کے تحت کسی اُستاد کے کمرے میں نہیں جاتے تھے کہ کہیں وہ مصروف نہ ہو، اور اُن کا جانا اس کو پسند نہ آئے۔اس لئے اُن کا زیادہ وقت اورینٹل کالج کے اسٹاف روم میں گذرتا تھا۔جو لوگ اُن سے مِلنا چاہتے تھے، وہ خود اُن کے پاس اسٹاف روم میں آتے تھے۔

مولانا ایک دن دوران گفتگو میں مجھ سے کہنے لگے "میں لوگوں سے، خاص طور پر سینئر اساتذہ سے مِلتے ہوئے گھبراتا ہوں۔اس خیال سے کہ کہیں کسی کے رویّے سے میری عزت نفس مجروح نہ ہو جائے"۔

میں نے کہا۔"لیکن مولانا! میرے کمرے میں تو ایسا نہیں ہو سکتا۔میرے دروازے تو ہر ایک کے لئے کھُلے رہتے ہیں، اور میں ہر ایک سے مِلتا ہوں۔دلچسپ باتیں کرتا ہوں، اور جس کا بھی جو کام ہو وہ کر دیتا ہوں"۔

کہنے لگے "آپ کی بات اور ہے، جب ہی تو میں آپ کے پاس بے تکلفی سے آجاتا ہوں۔ آپ پروفیسر ہیں، اُردو کے صدر شعبہ ہیں، پرنسپل ہیں، ڈین بھی ہیں۔لیکن آپ نے کبھی اپنے

Marfat.com

عمل سے کسی ملنے والے کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ آپ مصروف ہیں، یا کسی سے ملنا نہیں چاہتے۔ آپ کے ایسے لوگ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتے۔"

میں نے کہا "مولانا! یہ سب کچھ آپ کی محبت ہے، حسنِ ظن ہے، ورنہ مجھ سے نہ جانے کتنی کوتاہیاں سرزد ہوتی ہوں گی۔"

کہنے لگے "آپ تو "ڈنلپ" تک کو یہ احساس نہیں ہونے دیتے کہ اس کالج میں اس کی موجودگی آپ کو پسند نہیں۔ اس کے مزاج میں سوائے شر کے اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن آپ نے تو اُس کی شر تک کو گوارا کر لیا ہے۔"

میں نے کہا "مولانا ڈنلپ بھی تو آخر انسان ہے۔ اس کی شر پسندی کے باوجود، ہمیں اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ انسان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اپنے دشمنوں تک سے شفقت، اور محبت کا برتاؤ کرے۔"

اس قسم کی باتیں مولانا سے اکثر ہوتی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ اِن میں سے بعض خیالات سے وہ اتفاق نہیں کرتے تھے، بلکہ کہتے تھے کہ "دشمن، اور خاص طور پر شر پسند دشمن کو مزہ ضرور چکھانا چاہیئے تاکہ اُس کی شر کا خاتمہ ہو۔"

اور میں مولانا کی یہ باتیں سُن کر ہمیشہ مسکرا دیتا تھا۔

مولانا شمس ضلع کیمبل پور کے رہنے والے تھے۔ لیکن اس علاقے کی زبان کبھی نہیں بولتے تھے۔ ہمیشہ فصیح اُردو میں باتیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ اُن کے والد صاحب مرحوم علاج کی غرض سے لاہور آئے۔ مولانا نے اُن سے میری ملاقات کروائی۔ اُن سے مِل کر جی خوش ہوا۔ پُرانی وضع کے نہایت نستعلیق آدمی تھے۔ دھیمی آواز میں بات کرتے تھے۔ لہجے میں بڑی شیرینی تھی۔

میں نے اس ملاقات میں مولانا سے کہا "آپ کبھی کبھی اپنے والد صاحب سے تو اپنے علاقے کی زبان میں بات کر لیا کیجیئے۔"

مولانا کہنے لگے "وہ خود اس زبان میں مجھ سے بات نہیں کرتے تو میں کیا بات کروں گا۔ [illegible] زبان تو اُردو ہے۔ میں اُردو بولتا ہوں، اُردو پڑھتا ہوں، اُردو لکھتا ہوں۔ یہ زبان اتنی

Marfat.com

شیریں اور شائستہ ہے کہ ایک لمحے کے لئے بھی اس کو چھوڑ کر کسی دوسری زبان میں بات کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور پھر میں نے علم بھی اسی زبان میں حاصل کیا ہے۔ یہ میری دینی زبان بھی ہے۔ اس زبان میں جتنا دینی علوم کا سرمایہ ہے وہ کسی دوسری زبان میں مجھے نہیں ملا۔ یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ مسلمانوں نے تاریخ کے ہر دور میں اس کی آبیاری کی ہے۔ اسی لئے تو یہ زبان ہم تک ایک ترشی ہوئی صورت میں پہنچی ہے۔ کسی اور زبان کو اس کے ساتھ ملانا میرے خیال میں شرک ہے"۔

غرض مولانا دیر تک اس قسم کی باتیں کرتے رہے، اور میں اُن کی اِن خیال انگیز باتوں کو سن کر خاموشی کی زبان میں انہیں سراہتا رہا اور اُن کی داد دیتا رہا۔

مولانا نور الحسن خاں ایک بلند پایہ خطیب بھی تھے۔ تقریر کرتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سمندر موجیں مار رہا ہے۔ طالب علموں کو لیکچر دیتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دریا کی روانی اپنے شباب پر ہے۔ قُرآن کا درس دیتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رنگ و نور کے چشمے موج زن ہیں۔ تقریباً تیس سال تک انہوں نے ایک مسجد میں قرآن مجید کا درس دیا اور ایسے ایسے نکات اپنی دلنشیں خطابت کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں اُتارے کہ اُن کے ذہن روشن ہو گئے، اُن کی فکر پر جلا ہو گئی، اور وہ قرآن کریم کی حکمت کی دولتِ بیش بہا سے مالا مال ہو گئے۔

مولانا کا زیادہ وقت مطالعے میں گذرتا تھا۔ وہ اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتے تھے۔ اور مطالعے کے اس شوق فراواں نے انہیں علم کا ایک بحرِ ذخّار بنا دیا تھا۔ اسلامی علوم کے وہ بہت بڑے عالم تھے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کے علم میں اجتہادی آن بان تھی۔ وہ اسلامی تاریخ، تہذیب، قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ پر بڑی فکر انگیز باتیں کرتے تھے۔ اُن کی روشن خیالی سُونے پر سُہاگے کا کام کرتی تھی، دینی اور دُنیاوی مسائل کو حل کرنے میں اُن کا جواب نہیں تھا۔ ہر شخص کو مطمئن کرنے کی اُن کے اندر ایسی خداداد صلاحیت تھی جو میں نے بہت کم علماء میں دیکھی ہے۔

اورینٹل کالج میں اُنہوں نے اپنی زندگی کا بہترین زمانہ گذارا۔ تقریباً چالیس پینتالیس

Marfat.com

سال وہ مشرقی اور اسلامی علوم کے اس ادارے کے ساتھ منسلک رہے، اور انہوں نے درس وتدریس کی دُنیا میں ایسے کارنامے انجام دیئے جو اُن کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھیں گے۔ اُن کے بے شمار شاگرد جو پاکستان میں جگہ جگہ خدمات انجام دے رہے ہیں، وہ اُن کے ان کارناموں کے امین ہیں وہ سب اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ علم کی جس روشنی سے مولانا نے انہیں مالا مال کیا، اس روشنی کو وہ بھی دور دور تک پھیلا رہے ہیں۔

مولانا بُنیادی طور پر ایک استاد تھے۔ وہ درس وتدریس کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ اورینٹل کالج سے جب وہ ریٹائر ہوئے تو عرصے تک پنجاب کے محکمۂ اوقاف اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات میں درس دیتے رہے۔ پھر انہوں نے شاہدرہ میں اپنا ایک مدرسہ قائم کرلیا، جہاں مرتے دم تک انہوں نے درس وتدریس کا کام کیا۔ اس مدرسے سے انہیں بڑی محبت تھی چنانچہ مرنے کے بعد دفن بھی اسی مدرسے میں ہوئے۔

نورالحسن خاں صاحب ایک مثالی انسان، ایک مخلص دوست، ایک متبحر عالم اور ایک شفیق استاد تھے۔ اُن کی باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی، اور وہ صحیح معنوں میں ایک چمن زار اور بادِ نوبہار تھے۔

Marfat.com

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

بنجارہ روڈ، حیدرآباد دکن

۳ر اکتوبر ۱۹۲۳ء

حضرت چابک سوار صاحب، السلام علیکم!

میں آپ کو چابک سوار اس لئے کہتا ہوں کہ آپ ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہیں، اور اپنے گھوڑے ہوا میں پھنکارتے ہوئے اُڑے چلے جاتے ہیں" ——— نیازمند

عبدالحق

جب میں ۱۹۷۰ء میں اورینٹل کالج کا پرنسپل ہوا تو ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ایک دن اورینٹل کالج میں آئے، اور بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے خطوط مجھے دکھائے، تو میں اس خط کو پڑھ کر اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکا۔ دیر تک اس سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ مولوی صاحب مرحوم نے ان چند سطروں میں اُن کی ہو بہو تصویر کھینچ دی تھی۔

میں نے عبداللہ چغتائی صاحب کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، اور کہا "مولوی صاحب نے تو یہ خط لکھ کر آپ کو زندۂ جاوید کر دیا"۔

انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا "مولوی صاحب ہمیشہ مجھ پر شفقت فرماتے تھے، اور مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ چابک سوار انہوں نے مجھے اس لئے بھی کہا ہے کہ میں لاہور

Marfat.com

کے تاریخی محلہ چابک سواران کا رہنے والا ہوں۔اب بھی وہیں اپنے آبائی مکان میں رہتا ہوں۔
مولوی صاحب کے خطوط اسی پتے پر آتے تھے"۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے ان خطوط کو اورینٹل کالج میگزین میں شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔میں نے ان خطوط کو پڑھا، اور یہ خطوط مجھے نہایت دلچسپ اور مفید معلوم ہوئے چنانچہ میں نے اورینٹل کالج میگزین میں مولوی صاحب کے ان خطوط کو چھاپنے کا وعدہ کر لیا۔ڈاکٹر عبداللہ چغتائی یہ سن کر بہت خوش ہوئے، اور خطوط کا لفافہ میرے پاس چھوڑ گئے۔

اورینٹل کالج کی پرنسپلی کے زمانے میں چغتائی صاحب اکثر میرے پاس آتے تھے۔کام کی بات کرتے تھے میرے اصرار کے باوجود بیٹھتے نہیں تھے۔کھڑے کھڑے، جو کچھ کہنا ہوتا تھا، کہتے تھے، اور چند لمحوں میں ایک طوفان سا برپا کر کے چلے جاتے تھے۔وہ واقعی ہوا کے گھوڑے پر سوار دکھائی دیتے تھے۔

میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کی بڑی عزت کرتا تھا۔اس لئے کہ اُن کے مزاج میں درویشی تھی، اور اپنی بڑائی کا احساس انہیں بالکل نہیں تھا۔بظاہر وہ اول جلول سے آدمی نظر آتے تھے، لیکن وہ ایک عالم، اسلامی فن تعمیر کے بہت بڑے ماہر اور نہایت مخلص، سچے اور سادہ انسان تھے۔

دِلّی میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے مجھ سے اُن کا غائبانہ تعارف کرایا تھا، اور یہ کہا تھا کہ وہ مُصوّر مشرق عبدالرحمٰن چغتائی صاحب کے بھائی ہیں۔اسلامی فن تعمیر سے انہیں دلچسپی ہے۔پیرس یونیورسٹی سے انہوں نے تاج محل، کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے۔یورپ میں خاصا وقت گذارا ہے۔پہلے ماسٹر کہلاتے تھے کیونکہ لڑکوں کو پڑھاتے تھے، اب ڈاکٹر ہیں، اس لئے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کہلاتے ہیں۔کانفرنسوں کو ترتیب دینے اور کتابوں کی نمائش کرنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔سادہ انسان ہیں۔درویشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔نمود و نمائش سے انہیں نفرت ہے"۔

قیام پاکستان کے بعد جب میں لاہور آیا تو اُن سے مُلاقات ہوئی۔بہت سادہ آدمی معلوم ہوئے، قد لمبا، چھریرا بدن، گندمی رنگ لیکن سیاہی کی طرف مائل، کتابی چہرہ، اس پر خشخاشی داڑھی، سر پر ترکی ٹوپی، جسم پر مغربی لباس، پتلون کریز سے بے نیاز، کوٹ استری کے بغیر، جوتے

Marfat.com

پاشش سے محروم گرد میں اَٹے ہوئے۔ اس انداز سے عبداللہ چغتائی صاحب میرے پاس اورینٹل کالج میں آئے۔ میں نے انہیں پہچان لیا، اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُن کا استقبال کیا۔

میں نے مصافحہ کرنے کے بعد اُن سے کہا "تشریف رکھیئے"۔

لیکن وہ بیٹھے نہیں۔ کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہے۔

کہنے لگے "میں ذرا جلدی میں ہوں۔ بیٹھ گیا تو دیر ہو جائے گی۔ آپ کے لاہور آنے کی خبر مل گئی تھی۔ میں نے سوچا آپ سے ملتا چلوں"۔

میں نے کہا "چند منٹ تو بیٹھئے، آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب نے آپ کے بارے میں مجھ سے بہت کچھ کہا تھا۔ انہیں کے ذریعے سے غائبانہ تعارف ہوا۔ وہ آپ کے بڑے مداح ہیں۔ آپ کو اچھا انسان اور بڑا عالم سمجھتے ہیں"۔

چغتائی صاحب کہنے لگے "مولوی صاحب کی محبت ہے، ورنہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ وہ میرے محسن ہیں۔ مجھے اسلامی فنون لطیفہ، خصوصاً فن تعمیر سے دلچسپی ہے۔ لاہور کی تاریخی عمارتوں پر کام کر رہا ہوں۔ فنون لطیفہ سے دلچسپی مجھے ورثے میں ملی ہے۔ تاج محل کی تعمیر میں ہمارے آباؤاجداد کا ہاتھ تھا۔ مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی میرے بڑے بھائی ہیں۔ میں نے تاج محل کے موضوع پر پیرس یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ہے۔ اسلامیات کے شعبے میں لیکچر بھی دیتا ہوں۔ لیکن میں نے آپ کے کالج کے قریب اُردو بازار میں ایک کاپی شاپ کھول لی ہے۔ بس یہی میری معاش کا ذریعہ ہے"۔

یہ تمام باتیں چغتائی صاحب نے کھڑے کھڑے کیں۔ میں نے چائے کے لئے کہا تو کہا "چائے تو میں پیتا نہیں۔ بس آپ سے کھڑے کھڑے ملنے آیا تھا۔ انشاءاللہ آئندہ مُلاقاتیں ہوتی رہیں گی"۔

چغتائی صاحب نے چند منٹ میں اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا، اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کالج سے باہر چلے گئے۔

مجھے تو وہ اس پہلی ہی مُلاقات میں مردِ قلندر معلوم ہوئے۔ اُن کی گفتگو، اُن کے انداز، ان کے لباس اور اُن کے خیالات میں ایک قلندرانہ شان اور درویشانہ آن بان تھی جس سے

Marfat.com

وہ ہمیشہ پہچانے جاتے تھے۔ زندگی بھر وہ لاہور کی سڑکوں پر رواں دواں رہے۔

لاہور کی سڑکوں پر رواں دواں رہنے کا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ عبداللہ چغتائی صاحب ہمیشہ پیدل چلتے تھے۔ بلکہ رواں دواں رہتے تھے۔ میں نے اُن کو کبھی کسی سواری میں نہیں دیکھا۔

ایک دن یونیورسٹی گراؤنڈ کے سامنے والی سڑک پر رواں دواں تھے۔ میں نے گاڑی روکی اور کہا "چغتائی صاحب! کدھر جانے کا ارادہ ہے؟ میرے ساتھ چلئے۔ گاڑی میں بیٹھئے میں آپ کو پہنچا دوں گا۔"

عبداللہ چغتائی صاحب ایک لمحے کے لئے ٹھہرے، اور کہا "میں قریب ہی ایک کام سے جا رہا ہوں۔ آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ پیدل چلنا میری عادت ہے۔ اس سے مجھے فائدہ بھی ہوتا ہے۔"

اور یہ کہہ کر وہ پھر رواں دواں ہو گئے۔ میں اُن کے اس انداز کو دیکھ کر محظوظ ہوتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ اگلے وقتوں کے لوگ بھی نئی زندگی کی آسائشوں سے کس درجہ بے نیاز ہیں، اور کیسی درویشانہ اور قلندرانہ شان سے آسودگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس درویشانہ اور قلندرانہ شان سے زندگی بسر کرنے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہوس زر اُن میں نام کو نہیں تھی۔ رزق حلال کماتے تھے، اور اس میں مست اور مگن رہتے تھے۔ میں نے کبھی انہیں پیسے کے پیچھے دوڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔ انہوں نے کبھی کسی ادارے، اور کسی ناشر کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ کبھی کسی سے اپنی کتاب چھاپنے اور رائلٹی وصول کرنے کی درخواست نہیں کی۔ بس کاپی رائٹ کی آمدنی اُن کے لئے کافی تھی اور وہ اس سے مطمئن تھے۔ اس لئے کہ قلندر تھے۔ خودی اور خود داری کا احساس اُن کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی علمی آدمی تھے۔ اپنے زمانے کی عظیم ادبی شخصیتوں کے ساتھ اُن کا رابطہ تھا۔ علامہ اقبالؒ کی نجی محفلوں میں وہ شریک ہوتے تھے، اور علامہ اُن کی دلچسپ شخصیت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سے انہیں قربت حاصل تھی۔ وہ اُن کے مداح تھے، اور اُردو زبان سے متعلق بعض اہم کام اُن کے سپرد کرتے تھے۔ اورینٹل کالج کے استاد اور مشہور عالم اور محقق حافظ محمود شیرانی صاحب سے بھی

Marfat.com

اُن کی دوستی تھی، اور وہ بھی چغتائی صاحب کی شخصیت اور علمی کاموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ پونا، بمبئی اور حیدرآباد دکن میں بھی انہوں نے خاصا وقت گذارا تھا، اور وہاں کے علمی ادبی ماحول میں بھی خاصے مقبول اور مشہور تھے۔ لاہور کی بیشتر علمی شخصیتوں سے اُن کا رابطہ تھا، اور علمی ادبی محفلوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔

اُن کا زیادہ وقت مختلف قسم کے علمی کاموں میں گذرتا تھا۔ تاج محل پر اُنہوں نے تحقیق کی اور ایک ایسا تحقیقی کارنامہ پیش کیا جس پر اُنہیں پیرس یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی، اور اُن کے اس کارنامے کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی۔ انہوں نے مسجد وزیر خاں پر اعلےٰ درجے کا کام کیا جو پاکستان، ہندوستان اور انگلستان، جرمنی، روس اور امریکہ کے بڑے عالموں اور پروفیسروں سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔ اِن کاموں کے علاوہ انہوں نے کامران کی بارہ دری، چوبرجی، جہانگیر اور نورجہاں کے مقبروں، شالامار باغ اور بے شمار تاریخی عمارتوں پر گراں قدر مقالے لکھے ہیں جن سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ کاش اُن کی یہ تمام تحریریں یک جا ہو کر کتابی صورت میں شائع ہو جاتیں تاکہ ایک مورخ اور محقق کی حیثیت سے اُن کے کاموں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا۔ اُن کے بیشتر مضامین و مقالات اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ اس لئے اب لوگوں کی دسترس میں نہیں ہیں۔

میری پرنسپلی کے زمانے میں چغتائی صاحب نے اورینٹل کالج کے تحقیقی کاموں میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ مختلف موضوعات پر انہوں نے اورینٹل کالج میگزین کے لئے مقالات لکھے۔ کانفرنسوں اور سمیناروں کے موقع پر اورینٹل کالج کے اساتذہ کے تحقیقی کاموں کی نمائش کا اہتمام کیا، جس کی حکومت، یونیورسٹی اور اہل علم نے خوب خوب داد دی — اس کام کا انہیں بڑا سلیقہ تھا۔

۱۹۶۹ء میں یونیسکو اور وزارت تعلیمات حکومت پاکستان کے تعاون سے ہم لوگوں نے غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر ایک بین الاقوامی سیمینار کا ڈول ڈالا۔ عبداللہ چغتائی صاحب کو اس کی خبر ملی تو وہ خود میرے پاس آئے، اور کہا کہ "غالب کی تصانیف، اور اُن کے بارے میں جو کام ہوا ہے، اس موقع پر اُن سب کی نمائش ہونی چاہیئے"۔

میں نے کہا "آپ اس کی ذمہ داری قبول کیجیئے"۔

Marfat.com

کہنے لگے "میں حاضر ہوں۔ مجھے یہ کام کرکے بڑی مسرت ہوگی"۔
چنانچہ مشہور محقق غالبیات پروفیسر سید وزیرالحسن عابدی کے ساتھ مل کر انہوں نے ایک ایسی نمائش ترتیب دی جس کا ایک زمانے تک لاہور کے علمی حلقوں میں چرچا رہا۔
اور پھر جب ۱۹۷۲ء میں اورینٹل کالج کا جشن صد سالہ منایا گیا تو اس موقع پر بھی انہوں نے ڈاکٹر لائیٹنر سے لے کر اس زمانے تک کے اساتذہ کے علمی کاموں کی ایسی نمائش کا اہتمام کیا جس کو دیکھ کر اہل علم حیران رہ گئے۔ اخباروں نے اس موقع پر اُن کے بارے میں مضامین شائع کئے، اور باہر سے آئے ہوئے مندوبین نے اُن کے کام کو سراہا۔
چند سال قبل ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے گل برگ میں ایک مکان بنا لیا تھا۔ اسی میں رہتے تھے، اور وہیں اُنھوں نے اپنی ضرورت اور شوق کی کتابیں جمع کرکے ایک اچھی خاصی لائبریری بنالی تھی۔ ایک دن اپنے اس کتب خانے کو دکھانے کی غرض سے مجھے اپنے گھر لے گئے۔ اُن کے اس کتب خانے میں تاریخ اسلامی تہذیب مصوری، موسیقی اور ادب کے موضوعات پر کئی ہزار کتابیں تھیں۔ ان کتابوں کو انہوں نے بڑے سلیقے اور احتیاط سے ترتیب دیا تھا۔ مجھے اُن کے اس کتب خانے کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی، میں نے اُن کے سلیقے اور ذوق و شوق کی داد دی، اور اُن کے اس ذخیرے سے استفادہ بھی کیا۔ خدا کرے اُن کی وفات کے بعد یہ کتب خانہ محفوظ رہا ہو!
ڈاکٹر عبداللہ چغتائی جہاں گشت آدمی تھے۔ انہوں نے دُنیا دیکھی تھی۔ یورپ کے مختلف ممالک میں بھی سفر کیا تھا۔ وہاں کے کتب خانوں، علمی اداروں اور کتب فروشوں سے اُن کے تعلقات تھے۔ چنانچہ جب بھی انہیں یورپ جانے کا موقع ملتا تھا، وہ اِن تعلقات سے فائدہ اُٹھاتے تھے، اور واپسی پر اپنے کام کی کتابیں ضرور لاتے تھے جو اُن کے ذاتی کتب خانے کی زینت تھیں۔ اپنی محدود آمدنی میں سے وہ خاصی رقم کتابوں پر صَرف کرتے تھے۔ لاہور کے پُرانے کتب فروشوں سے تو اُن کی دوستی تھی، اور وہ اُن کے توسط سے نادر و نایاب کتابیں حاصل کر لیتے تھے، اور اُن کے پاس ایسی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔
میں جس زمانے میں لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں پڑھا رہا تھا، وہ کسی سیمینار میں شرکت کے لئے تاشقند گئے۔ کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد سیدھے لندن آئے۔

Marfat.com

میں ایک دن برٹش میوزیم کے شعبۂ مشرقی کے کتب خانے میں کام کر رہا تھا کہ دیکھا عبداللہ چغتائی صاحب ازبکستان کی مخصوص ٹوپی پہنے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ لائبریری میں تو اُن سے باتیں ہو نہیں سکتی تھیں، اس لئے میں انہیں میوزیم کے ریسٹورنٹ میں لے گیا، وہاں ہم نے چائے پی اور باتیں کیں۔ چغتائی صاحب لندن سے خوب واقف تھے۔ کیونکہ پیرس یونیورسٹی کے دوران قیام میں اکثر اُن کا لندن آنا جانا رہتا تھا۔

دوران گفتگو کہنے لگے "لندن تو بیرا دیکھا ہوا ہے۔ اب یہاں کسی جگہ کو دیکھنے کی ہوس نہیں۔ البتہ لائبریریاں اور کتب فروشوں کی دوکانیں ضرور دیکھنی ہیں۔ کچھ پیسے تن پیٹ کاٹ کر بچائے ہیں، اِن کو کتابوں پر خرچ کروں گا۔ صرف چند روز کا یہاں قیام ہے۔ سوچتا ہوں۔ جلدی یہ کام کرلوں"۔

میں نے کہا "میں کئی سال سے لندن میں ہوں۔ شہر سے خوب واقف ہوں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔ جب تک جی چاہے یہاں قیام کیجئے۔ میرا غریب خانہ حاضر ہے"۔

کہنے لگے "آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں ایک دوست کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ آپ کے ہاں بھی ٹھہر سکتا تھا لیکن وہ ناراض ہو جائیں گے۔ اس لئے مجبور ہوں۔ رشتوں کی نزاکت کا خیال رکھنا چاہیئے"۔

میں نے کہا "میں آپ کے مزاج کو سمجھتا ہوں، اور آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن کوئی ضرورت ہو تو مجھے بے تکلفی سے بتائیے گا"۔

یہ باتیں کر کے وہ رخصت ہوئے۔ لیکن برٹش میوزیم میں روزانہ آتے رہے، اور اُن سے میری مُلاقاتیں ہوتی رہیں۔

کوئی ایک ہفتہ وہ لندن میں رہے۔ روزانہ مجھ سے ملاقات ہوتی تھی۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی لائبریریوں میں کچھ وقت گذارنے کے بعد وہ پُرانے کتب فروشوں کے ہاں چلے جاتے تھے۔ اس سفر میں بھی انہوں نے خاصی تعداد میں کتابیں جمع کرلیں، اور نہ جانے کس طرح اپنے ساتھ اِن کتابوں کو ہوائی جہاز میں لاہور لے بھی گئے۔

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نہایت سادہ اور معصوم آدمی تھے۔ نمود و نمائش سے انہیں نفرت تھی۔

Marfat.com

جفاکشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ محنت سے کبھی گھبراتے نہیں تھے۔ اُن کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ کبھی کسی بات کو چھپاتے نہیں تھے۔ دوٹوک بات کہنا اُن کا مزاج تھا۔ کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ انہیں درویش اور قلندر کہا جائے تو بے جا نہیں، اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اُن کی درویشی اور قلندری دیکھنے کی چیز تھی۔ اس درویشی اور قلندری کے ان گنت روپ تھے جو اُن کی وضع قطع، مزاج اور انداز گفتگو میں اپنا جلوہ دکھاتے تھے۔

اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے سے چند مہینے قبل انہوں نے لاہور ٹیلی ویژن پر ایک انٹرویو دیا تھا، جس میں اپنے بارے میں بے شمار دلچسپ باتیں کی تھیں، اور آخر میں جب اُن سے یہ پوچھا گیا تھا کہ "آپ کوئی پیغام دینا چاہیں گے تو انہوں نے صرف یہ کہا تھا کہ "انسان کو سچ بولنا چاہیئے اور لگن سے کام کرنا چاہیئے"۔

اور واقعی وہ اس دور پُرآشوب میں بھی سچائی اور لگن کا ایک مجسمہ تھے۔!

Marfat.com

ڈاکٹر برکت علی قُریشی

ڈاکٹر برکت علی قُریشی اپنی صورت شکل، اپنے انداز و آداب، اپنے مزاج اور اُفتادِ طبع، اپنے لباس اور اپنے رہن سہن کے طور طریقوں سے جرمن معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے خاصا عرصہ اپنی تعلیم اور تحقیقی مصروفیات کے سلسلے میں جرمنی میں گذارا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے عربی زبان و ادب میں ام۔اے کرنے کے بعد وہ جرمنی چلے گئے تھے، اور وہاں کی برلن یونیورسٹی میں کئی سال رہ کر انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ جرمنی کے بڑے بڑے اسکالروں سے اُن کا رابطہ رہا تھا۔ وہاں کی علمی، تعلیمی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی بنیادی خصوصیات اُن کی شخصیت میں کچھ اس طرح شیر و شکر ہو گئی تھیں کہ اُن کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب بہت وجیہہ، خوش شکل اور شان دار آدمی تھے۔ گول بھرا بھرا چہرہ، سُرخ سفید رنگ، چھ فٹ سے زیادہ قد کسی قدر مائل بہ فربہی، تندرست و توانا جسم لیکن اس کو موٹا پا نہیں کہا جا سکتا۔ سر کے بال غائب۔ ماتھے پر شکنیں، سفید دانت موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے، آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، شگفتہ و شاداب چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی، ــــ لیکن اس کے باوجود آفتاب و ماہتاب کی طرح روشن!ــــ

یہ تھے اورینٹل کالج میں عربی کے پروفیسر اور پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر برکت علی قریشی جو اپنی طرح داری، اور شان و شکوہ سے پہچانے جاتے تھے۔ اُن کے مزاج میں تنہائی پسندی اور

Marfat.com

گوشہ نشینی تھی۔ بہت کم لوگوں سے مِلتے تھے۔ باتیں بہت کم کرتے تھے۔ کالج میں اُن کو کبھی اپنے کمرے سے نکل کر باہر گھومتے پھرتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا۔ سوائے اس کے کہ جب وہ کالج آتے تھے یا جب کالج سے گھر واپس جاتے تھے۔ لیکچر بھی ام۔ اے عربی کی جماعتوں کو اپنے کمرے ہی میں دیتے تھے، اور دفتری کام بھی اپنے کمرے ہی میں کرتے تھے۔ خواہ مخواہ اساتذہ یا ملنے والوں کو اپنے کمرے میں بٹھائے رکھنا اُن کے مزاج کے خلاف تھا۔ لیکچر سے پہلے اور لیکچر کے بعد وہ مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ سوائے مطالعے کے اُن کی کوئی اور دلچسپی نہیں تھی۔ وہ عربی زبان و ادب اور اسلامی علوم کے بہت بڑے عالم تھے۔ علم سے ان کی اس وابستگی میں بھی جرمن پروفیسروں کی آن بان نظر آتی تھی۔

صبح کو نو بجے کے قریب اُن کی فیروزی رنگ کی بہت بڑی بیوک کار کالج کے پھاٹک میں داخل ہوتی تھی۔ اُن کا شوفر اس کار کو کالج کے صدر دروازے پر روکتا تھا۔ پروفیسر صاحب کار سے اُترتے تھے اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ کسی کی طرف دیکھتے نہیں تھے۔ پیچھے پیچھے اُن کا چپراسی کتابیں اور پورٹ فولیو وغیرہ اُٹھا کر لاتا تھا، اور کمرے میں ان کی میز پر رکھ دیتا تھا۔ پروفیسر صاحب تھوڑی دیر اپنے کاغذات دیکھتے تھے۔ اسی اثنا میں دفتر کا سپرنٹنڈنٹ ڈاک لے کر آجاتا تھا۔ پروفیسر صاحب چند منٹ میں اس کام کو مکمل کرتے تھے، اور پھر مطالعے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ لیکچر کا وقت ہوتا تھا تو طالب علم آجاتے تھے۔ ایک گھنٹہ وہ اِن طالب علموں کو لیکچر دیتے تھے۔ ایک بجے کے قریب اُن کی یہ مصروفیات ختم ہو جاتی تھیں، اور وہ اپنی شان دار بیوک میں بیٹھ کر گھر چلے جاتے تھے۔ برسوں اُن کا یہی معمول رہا۔

ڈاکٹر قریشی صاحب بڑے ہی خوش لباس اور جامہ زیب انسان تھے۔ اُن کی قمیصیں سویڈن سے سِل کر آتی تھیں۔ سوٹ جرمنی یا انگلستان سے منگواتے تھے۔ شہر لاہور میں ایسی خوبصورت قمیصیں اور اتنا شاندار سوٹ کوئی اور نہیں پہنتا تھا۔ قمیصوں اور سوٹوں کے رنگ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کرتے تھے۔ اُن کے لباس پر کبھی کوئی شکن نہیں دیکھی۔ دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُن کی پتلون، اُن کا کوٹ اور اُن کی ٹائی ابھی ابھی کسی ایسی مشین میں سے نکل کر آئے ہیں جو ہر چیز کو جاذب نظر بنانے میں کمال رکھتی ہے۔

Marfat.com

جب تک وہ اورینٹل کالج میں رہے اُن کے اس لباس اور شاہانہ انداز میں کبھی بھی فرق نہیں آیا، ڈاکٹر قریشی گھر کے رئیس تھے۔ اُن کے پاس دولت بہت تھی۔ جائداد بہت تھی، اور وہ اس دولت کا مصرف اور جائداد سے فائدہ اٹھانا بخوبی جانتے تھے۔ پروفیسری تو اُن کے لئے ایک مشغلہ تھا۔ اُن کے اخراجات پروفیسر کی تنخواہ سے کئی گُنا زیادہ تھے۔ انہیں اچھی طرح رہنے سہنے کا سلیقہ آتا تھا، اور واقعی وہ بادشاہوں کی طرح رہتے تھے۔ وہ بڑے ہی باذوق انسان تھے، اور اُن کی اس خوش ذوقی اور سلیقہ شاعری کا اظہار اُن کے ہر انداز سے ہوتا تھا۔

تعلیمی سال وہ لاہور میں گذارتے تھے، لیکن موسم گرما کی تعطیلات جیسے ہی شروع ہوتی تھیں، وہ یا تو یورپ چلے جاتے تھے یا پھر مری کے ہوٹل عیسل میں قیام کرتے تھے۔ ایک نمبر کمرہ اُن کے لئے ہمیشہ ریزرو رہتا تھا۔ برسوں ان کے ان معمولات میں فرق نہیں آیا۔

ڈاکٹر برکت علی قریشی صاحب کا تعارف مجھ سے بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے کروایا، اور انہیں کے ذریعے سے مجھے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا علم ہوا۔ انہوں نے مجھے اورینٹل کالج کے شعبۂ اُردو میں بڑی عزت اور احترام کے ساتھ بلایا۔ مجھے خاص طور پر اپنے ذاتی خط کے ساتھ آفر بھیجا، اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اُن کی شفقت اور محبت ہی کی وجہ سے میں نے اس آفر کو قبول کیا۔ اُنہیں کی وجہ سے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک صاحب نے مجھ پر شفقت فرمائی، اور مجھے انہوں نے بھی ذاتی خطوط لکھ کر یہ اصرار کیا کہ مجھے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں آجانا چاہیئے، اور اُردو زبان و ادب اور پاکستان کی خدمت کرنی چاہیئے۔ چنانچہ میں نے اِن بزرگوں کی وجہ سے اس آفر کو قبول کیا، اور میں اورینٹل کالج میں آگیا۔

میں جب اورینٹل کالج میں آیا تو ڈاکٹر قُریشی صاحب شام، لبنان اور اُردن میں پاکستان کے سفیر ہو کر بیروت چلے گئے تھے۔ سال ڈیڑھ سال ان ملکوں میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے رہے۔ لیکن میرے یہاں آنے کے چند مہینے بعد ہی وہ اورینٹل کالج میں اپنی جگہ پر واپس آگئے۔ غالباً سفارت اُن کے مزاج کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ دراصل وہ علمی آدمی تھے۔ سفارت کے بکھیڑوں میں کس طرح خوش رہتے۔ پھر لاہور اور اورینٹل کالج کی یاد بھی

Marfat.com

غالباً انہیں ستاتی رہی۔اس لئے سفیر کے مقابلے میں پروفیسر اور پرنسپل ہونا مناسب سمجھا۔اور ایک دن بغیر کسی اطلاع کے صبح کے وقت اورینٹل کالج میں آکر اپنے کمرے میں بیٹھ گئے۔ اُن کے آنے سے اورینٹل کالج میں بے یقینی اور کس مپرسی کی جو کیفیت تھی وہ ختم ہوگئی،اور اورینٹل کالج ان کی دلکش شخصیت کی چاندنی سے ایک دفعہ پھر جگمگا اُٹھا۔

مجھے اورینٹل کالج میں آئے ہوئے ابھی چند مہینے ہی ہوئے تھے،اور میں ڈاکٹر قُریشی صاحب کے یہاں نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہونے والی غیر یقینی کیفیت سے کچھ پریشان سا تھا۔بہت سے معاملات تو قریشی صاحب طے کر کے گئے تھے،لیکن اُن کے جانے کے بعد کچھ اُلجھنیں پیش آئیں،جن کی وجہ سے میں شروع شروع خاصا دل برداشتہ رہا۔خدا جانے کس طرح قریشی صاحب کو ان باتوں کا علم ہوگیا۔چنانچہ جس دن وہ کالج میں تشریف لائے اُنہوں نے مجھے یہ پیغام بھیجا کہ گیارہ بجے میرے کمرے میں آیئے،اور کافی کی ایک پیالی میرے ساتھ پیجئے۔

میں ٹھیک گیارہ بجے اُن کے کمرے میں پہنچا۔بہت اچھی طرح ملے۔معانقہ کیا۔پھر دفتر کی کرسی سے اُٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئے،اور مجھے بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا،اور حال احوال پوچھا۔

کہنے لگے "آپ کو لاہور میں آئے ہوئے اب تو کئی مہینے ہو چکے ہیں۔اُمید ہے اب آپ کا دل یہاں لگ گیا ہوگا"۔

میں نے کہا "مجھے سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ آپ نے ازراہِ نوازش مجھے بڑی شفقت اور محبت سے یہاں بُلایا،اور آپ کی وجہ سے مجھے اورینٹل کالج میں کام کرنے کا موقع ملا۔میں اورینٹل کالج کی روایت سے بخوبی واقف ہوں۔لاہور سے بھی میں پوری طرح آشنا ہوں۔یہ شہر مجھے ہمیشہ سے پسند ہے۔یہاں ادیب،شاعر اور ناشر بھی میرے جاننے والے ہیں۔وقت تو اچھا گذر رہا ہے۔لیکن یہاں کالج میں گھٹن اور بیتیرے بازی بہت ہے۔اس ماحول میں دل کبھی کبھی گھبراتا ہے"۔

قُریشی صاحب کہنے لگے "مجھے اِن تمام حالات کا علم ہے۔ڈاکٹر عُمر حیات ملک صاحب

Marfat.com

وائس چانسلر نے آپ کے تقرر میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا تھا، وہ تو اب انڈونیشیا میں سفیر ہو کر چلے گئے ہیں لیکن چلتے وقت وہ مجھ سے یہ کہہ گئے تھے کہ میں آپ کا خاص طور پر خیال رکھوں۔ آپ یہاں آئے تو میں مُلک سے باہر چلا گیا۔ اب واپس آگیا ہوں۔ کل نئے وائس چانسلر ڈاکٹر جسٹس رحمٰن صاحب سے میری مُلاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے خاص طور پر آپ کا ذکر کیا تھا، اور مجھ سے کہا تھا کہ آپ کا خاص طور پر خیال رکھوں تاکہ آپ دل برداشتہ نہ ہوں۔ انہوں نے آپ کے بارے میں کچھ خصوصی احکام بھی صادر کئے ہیں۔ کل تک وہ کاغذ میرے پاس آجائے گا۔ آپ بالکل فکر نہ کیجئے۔ اطمینان سے یہاں رہیئے۔ میں یہاں موجود ہوں۔ آپ کو انشاءاللہ کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ تو اُردو کے شعبے میں سب سے سینئر ہیں۔ آپ کا مستقبل یہاں روشن ہے، اور انشاءاللہ روشن ہی رہے گا۔"

میں نے قُریشی صاحب کی یہ باتیں سُنیں، اور مجھے اُن کی اِن باتوں سے بڑا سکون اور اطمینان نصیب ہوا۔ خاصی دیر تک میں اُن کے پاس بیٹھا۔ ہم لوگ کافی پیتے رہے، اور باتیں کرتے رہے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک اُن سے باتیں کرنے کے بعد میں نے اجازت لی۔

قریشی صاحب نے چلتے وقت مجھ سے کہا "کل گیارہ بجے میرے پاس ضرور آئیے۔ انشاءاللہ سارے مسائل کل حل ہو جائیں گے۔"

دوسرے دن گیارہ بجے میں پھر قریشی صاحب کے پاس گیا۔ اُن کے سامنے ایک فائل رکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے پھر اپنے پاس بٹھایا، اور وہ فائل میری طرف بڑھا دی، اور کہا کہ "اس کو ذرا اطمینان سے پڑھ لیجئے۔"

اس فائل میں سب سے پہلے میری نظر رحمٰن صاحب کے نوٹ پر پڑی جس میں یہ لکھا تھا کہ ڈاکٹر عبادت اُردو کے شعبے میں سب سے سینئر اُستاد ہیں۔ انہیں زیادہ کام ام۔ اے اور پی ایچ ڈی کا دینا چاہیئے۔ ہم نے انہیں خاص طور پر یہاں بُلایا ہے۔ اُن کے علم اور تجربے سے ہم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا چاہیئے۔"

قریشی صاحب کہنے لگے "میں آپ کو فرائض کے بارے میں مفصل خط لکھ رہا ہوں۔ اس میں رحمٰن صاحب کے احکام بھی نقل کر دوں گا۔ اب انشاءاللہ کوئی اُلجھن باقی نہیں رہے گی۔"

Marfat.com

دوسرے دن مجھے قریشی صاحب کا مفصل خط ملا جس میں میرے تقرر، اور وائس چانسلر صاحب کے احکام کی تفصیل تھی۔ اس خط نے میری تمام الجھنوں اور پریشانیوں کا خاتمہ کر دیا، اور میں اورینٹل کالج میں اطمینان سے کام کرنے لگا۔

ڈاکٹر برکت علی قریشی بڑے ہی معاملہ فہم انسان تھے۔ بعض لوگوں کی کمزوریوں اور نفسیاتی بیماریوں کا انہیں پوری طرح اندازہ تھا۔ وہ حالات کو خوب سمجھتے تھے، اور فیصلے کرنے میں انہیں مطلق کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ وہ ایک عظیم انسان اور علم دوست آدمی تھے۔ پڑھنے لکھنے والوں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ میرے علمی ادبی کام میں انہوں نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ اکثر ان کاموں کی تفصیل مجھ سے پوچھتے رہتے تھے، اور میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

میرا خیال تھا کہ قریشی صاحب عربی کے پروفیسر ہیں، اس لئے اُن کی دلچسپی صرف عربی ادبیات اور اسلامیات تک محدود ہوگی، لیکن کئی مُلاقاتوں کے بعد مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ وہ اُردو ادب کا بھی نہایت ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ اُردو شعراء کے بے شمار اشعار انہیں یاد تھے، اور وہ ان کو اپنی گفتگو میں برمحل استعمال کر کے جی خوش کر دیتے تھے۔ اُن کی گل افشانیٔ گفتار کا عالم محفلوں کو دامان باغباں و کف گل فروش بنا دیتا تھا۔

پروفیسر صاحب بظاہر غیر معمولی طور پر سنجیدہ نظر آتے تھے۔ لیکن جب ماحول اُن کے مزاج کے مطابق ہوتا تھا تو اُن کے علمی مزاج اور ادبی ذوق کے دروازے کھُل جاتے تھے، اور اُردو، فارسی، عربی، انگریزی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں کے ادبیات پر اُن کی بصیرت افروز اور عالمانہ باتیں سُننے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اِن زبانوں پر اُن کی گہری نظر تھی۔ وہ اِن کے قواعد اور اُن کی باریکیوں سے پوری طرح آشنا تھے۔ ان کے لسانی اسرار و رموز کا انہیں پوری طرح علم تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک ماہر لسانیات اور گرامیرین (ماہر قواعد) تھے۔ زبانوں کے بارے میں اُن کا علم جرمن پروفیسروں کی یاد کو تازہ کرتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ادبیات کے بھی باذوق رمز شناس تھے۔ ادبیات کا مطالعہ انہوں نے بڑی محنت سے کیا تھا۔ اُن کا مزاج اس میں شبہ نہیں کہ کلاسیکی تھا، اور وہ کلاسیکی ادبیات ہی سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے لیکن جدید ادبیات سے بھی انہیں دلچسپی تھی۔ جدید ادبیات کی رومانی تحریکوں کا بھی انہوں نے مطالعہ کیا تھا، اور عالمی ادبیات کی جدید

Marfat.com

تحریکوں پر عالمانہ گفتگو کرتے تھے۔ اُن کی تنقیدی بصیرت میں تجزیاتی رنگ و آہنگ اپنی جھلکیاں دکھاتا تھا۔

وہ اُس ماحول کی پیداوار تھے جس میں اُردو شاعری سے دلچسپی مہذب اور شائستہ ہونے کی نشانی بھی جاتی تھی۔ انہوں نے مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا ابوالکلام آزاد، بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر عبداللہ یوسف علی اور مرزا محمد سعید کے ساتھ خاصا وقت گذارا تھا۔ ان بزرگوں کی صحبتوں نے اُن کے مزاج میں اُردو شاعری کا ایسا رچا ہوا ذوق پیدا کر دیا تھا جس کا اظہار اُن کی گفتگو اور بات چیت میں بڑے بانکپن کے ساتھ ہوتا تھا۔ میر، غالب، مومن، حالی، حسرت، فانی، اصغر، جگر اور یاس یگانہ کے بے شمار اشعار انہیں یاد تھے، اور وہ اپنی گفتگو میں برمحل ان اشعار کو اس طرح استعمال کرتے تھے کہ محفل میں رنگینیاں اور رعنائیاں رقص کرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

میں ایک دن پروفیسر صاحب کی خدمت حاضر ہوا تو بات مشرقی ممالک خصوصاً ہندوستان پاکستان کے کھانوں پر چل نکلی۔ مختلف ممالک کے کھانوں کے بارے میں اُن کی معلومات حیرت انگیز تھی اور کھانوں کے معاملے میں ذوق بھی ایسا نکھرا ہوا تھا کہ میں نے کم لوگوں میں دیکھا ہے۔ اس معاملے میں بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کا نام سرفہرست ہے۔ دوسرے نمبر پر ڈاکٹر برکت علی قریشی آتے ہیں — دونوں کھانوں کے بارے میں بڑا پاکیزہ اور نکھرا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ دونوں مشرقی کھانوں کے دلدادہ تھے، اور بڑی نفاست کے ساتھ مشرقی کھانے کھاتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب اسی ملاقات میں مجھ سے کہنے لگے۔ "میں نے تقریباً تمام مہذب ملکوں کے کھانے کھائے ہیں۔ خصوصاً یورپ کے دوران قیام میں مجھے اس کے بہت مواقع ملے ہیں۔ یورپ کے کھانے سیٹھے پھیکے ہوتے ہیں۔ اُن میں صرف غذائیت کا خیال رکھا جاتا ہے، سوائے اٹلی، ترکی اور فرانس کے — لیکن جو مزہ ہمارے کھانوں میں ہے وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ ہندوستان پاکستان کے کھانے لذیذ بھی ہوتے ہیں، اور خوش رنگ اور خوشبودار بھی۔ اور پھر ہمارے ہر ایک کھانے کا مزہ الگ ہے۔ یورپ والے تمام کھانوں کو ملا کر کھاتے ہیں۔ ہمارے کھانے ایسے

Marfat.com

ہیں کہ ہر ایک کا مزہ اور خوشبو الگ ہے۔ اسی لئے ہم ہر کھانے کو الگ الگ کھاتے ہیں، اور اس کے منفرد ذائقے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مثلاً ہماری بریانی میں کوئی چیز ملائی نہیں جا سکتی۔ اگر اس کے ساتھ قورمہ ملا لیا جائے تو اس کا صحیح ذائقہ مجروح ہو جاتا ہے۔ انگریزوں نے یہاں یہ بدعت شروع کی، اور اب یہ بات عام ہو گئی ہے کہ لوگ شوربا ملا کر بریانی کھاتے ہیں۔ یہ اس لطیف کھانے کے ساتھ بڑا ظلم ہے"۔

میں پروفیسر صاحب کی یہ دلچسپ باتیں مزے لے لے کر سنتا رہا، اور اس معاملے میں چہرے کی مختلف کیفیات سے، اُن کے ذوقِ لطیف کی داد دیتا رہا۔

پھر ہمت کر کے اُن سے کہا "اگر آپ کسی دن وقت نکال کر غریب خانے پر تشریف لائیں اور میرے ساتھ ماحضر تناول فرمائیں تو آپ کی نوازش ہوگی۔ بعض کھانے آپ کو یقیناً پسند آئیں گے"۔

پروفیسر صاحب نے میری یہ دعوت قبول فرمالی اور کہا "میں ضرور آپ کے ہاں آؤں گا"۔

چنانچہ ہفتے کی شام کو اُن کی دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ میری والدہ مرحومہ نے خاص طور پر اپنے ہاتھ سے بریانی، قورمہ، کوفتے، کباب وغیرہ پکائے۔ پروفیسر تشریف لائے، دعوت میں شریک ہوئے، اور ایک ایک کھانے کی دل کھول کر داد دی۔

بریانی کے بارے میں فرمایا "اس بریانی میں بریانی کا صحیح مزہ اور خوش لو ہے۔ قورمہ بہت ہی لذیذ ہے، اور کوفتوں میں کوفتے کی صحیح خوشبو ہے، اور شامی کبابوں کا تو جواب ہی نہیں۔ بعض لوگ شامی کباب میں انڈہ ملا دیتے ہیں۔ اس سے اُس کے ذائقے میں فرق آجاتا ہے۔ یہ صحیح تلے ہوئے ہیں"۔

غرض دیر تک وہ مختلف کھانوں کی داد دیتے رہے، اور مجھے اُن کا انداز بہت پسند آیا کئی گھنٹے دلچسپ صحبت رہی۔ اس کے بعد جب بھی اُن سے ملاقات ہوتی تھی، وہ ان کھانوں کی تعریف کرتے تھے۔ اور میں اُن کی اِن باتوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

کھانے کے بعد پروفیسر صاحب اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر اُن کی سنجیدگی ختم ہو جاتی تھی، اور وہ نہایت ثقہ انداز میں لطیفے سناتے اور میر، غالب، مومن اور داغ کے نہایت ہی دلچسپ شعریت سے بھرپور اشعار اس طرح پڑھتے تھے کہ محفل زعفران زار

Marfat.com

بن جاتی تھی۔

قریشی صاحب کے مزاج میں برعظیم کے مسلمانوں کی تہذیب کا رنگ رچا ہوا تھا۔ اور وہ اس کا اظہار ایسے مواقع پر بھرپور انداز میں کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر اُن کی مخصوص سنجیدگی اُن کا ساتھ چھوڑ دیتی تھی، اور وہ ایک سنجیدہ پروفیسر کی بجائے ایک مجلسی انسان معلوم ہوتے تھے۔ خود بھی ہنستے تھے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے۔

ڈاکٹر برکت علی قریشی اورینٹل کالج میں کوئی بارہ سال عربی کے پروفیسر اور کالج کے پرنسپل رہے۔ ۱۹۴۲ء میں جب پروفیسر محمد شفیع اورینٹل کالج میں عربی کے پروفیسر اور کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تو پنجاب یونیورسٹی نے انہیں اورینٹل کالج میں عربی کا پروفیسر مقرر کیا۔ ۱۹۴۸ء میں وہ پروفیسر اقبال کے انتقال کے بعد پرنسپل ہو گئے۔ اس طرح وہ کوئی بارہ چودہ سال اورینٹل کالج سے منسلک رہے۔ ۵۵-۱۹۵۴ء کے تعلیمی سال میں ڈاکٹر قریشی صاحب اورینٹل کالج کی ملازمت سے سبک دوش ہوئے، اور جرمنی چلے گئے جہاں انہیں برلن یونیورسٹی میں عربی کی پروفیسرشپ مل گئی۔ ۱۹۶۰ء تک وہ برلن یونیورسٹی میں پروفیسر رہے، اور اسی سال جرمنی ہی میں اُن کا انتقال ہوا۔

اورینٹل کالج میں ڈاکٹر قریشی کا زمانہ بہت ہی پرسکون زمانہ تھا۔ اُن کے زمانے میں کالج میں کوئی شور شغب نہیں تھا۔ کوئی سیاست نہیں تھی۔ کسی قسم کی سازش کا ماحول نہیں تھا۔ لڑائی جھگڑے نہیں تھے۔ اس وقت کالج میں عربی، فارسی اور اُردو کے تین شعبے تھے۔ ان میں کوئی پروفیسر نہیں تھا۔ صرف ریڈر شعبوں کو چلاتے تھے۔ پروفیسر صاحب شعبوں کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ اس لئے کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوتی تھی۔ ویسے بھی اُن کا رعب اور دبدبہ ایسا تھا کہ کوئی اُن سے اختلاف کی جُرأت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی کام کو روکتے نہیں تھے۔ کسی کو پریشان نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر ایک کی عزت کرتے تھے۔ اس لئے اُن کا بڑا احترام تھا۔ اُن کے بعد یہ فضا باقی نہ رہ سکی، اور اُن کے رُخصت ہوتے ہی جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔

رُخصت ہونے سے قبل ایک دن انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بُلایا، اور کوئی دو گھنٹے تک مجھ سے باتیں کیں۔ مجھے یونیورسٹی اور کالج کے حالات سے آگاہ کیا۔

Marfat.com

کہنے لگے "میرے جانے کے بعد یہاں کی فضا سازگار نہیں رہے گی۔ لوگ ذاتی مفاد کے لئے آپس میں لڑنے لگیں گے، اور سازش کا ماحول پیدا ہو جائے گا۔ اورینٹل کالج ہمیشہ سے تضادات کا شکار رہا ہے۔ بیشتر لوگ اب اساتذہ میں ایسے ہیں جنہوں نے اپنی تعلیم کا آغاز مسجدوں اور مکتبوں سے کیا۔ پھر معمولی ملازمتیں کیں، انہوں نے کوئی یونیورسٹی نہیں دیکھی۔ باہر کے ملکوں کے تعلیمی نظام کا انہیں کوئی تجربہ نہیں۔ ساری خرابی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ الزام تراشی اور لگائی بجھائی کا مرض ان میں سے بیشتر میں عام ہے۔ میں جب یہاں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے آیا تو میرے بارے میں بعض لوگوں نے یہ کہا کہ میرے پاس کوئی ڈگری ہی نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لوگوں کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ میں نے اس فضا کا خاتمہ کیا، اور مجھے اس میں پوری طرح کامیابی ہوئی۔ میں نے یہاں وہ ماحول پیدا کیا جو میں نے جرمنی اور انگلستان کی یونیورسٹیوں میں دیکھا تھا۔ اس لئے میرے زمانے میں فضا پرسکون رہی، اور تدریس و تحقیق کا کام بھی اچھا خاصا ہوا۔ اساتذہ کو آزادی بھی ملی جس کے نتیجے میں اورینٹل کالج کے شعبے پھلے پھولے۔ یہ باتیں میں اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ اس فضا کو برقرار رکھیں، اور اپنے رفقا کو بھی اس کی طرف توجہ دلائیں۔ اس فضا اور ماحول کے بغیر تعلیمی اداروں میں ہر شخص کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔"

میں نے کہا "میں انشاء اللہ آپ کی ہدایات پر عمل کروں گا، اور اپنی سی پوری کوشش کروں گا کہ آپ کی قائم کی ہوئی صاف ستھری فضا اورینٹل کالج میں برقرار رہے۔"

اورینٹل کالج میں ڈاکٹر قریشی صاحب سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔

اس کے بعد جرمنی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر کی حیثیت سے دو سال گذار کر وہ موسم گرما کی تعطیلات میں لاہور تشریف لائے۔ مجھے اطلاع ملی تو میں ان کی جائے قیام برڈ وود روڈ پر ان سے ملنے گیا۔ اطلاع کروائی۔ فوراً باہر تشریف لے آئے۔ بڑی محبت سے ملے۔ ڈرائنگ روم میں بٹھایا، حال احوال پوچھا اور خاصی دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے۔

پوچھا اورینٹل کالج کا کیا حال ہے؟

میں نے کہا آپ نے جو پیش گوئی کی تھی وہ پوری ہو گئی۔ جھگڑے فساد شروع ہو چکے ہیں۔

Marfat.com

سب آپس میں ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں تفصیل آپ کو کیا بتاؤں؟ آپ کی طبیعت کو بدمزہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں الگ تھلگ رہتا ہوں۔ کالج آتا ہوں۔ پڑھاتا ہوں۔ پھر لائبریری چلا جاتا ہوں۔ خاصا کام ہو گیا ہے۔ میری کئی کتابیں چھپ گئی ہیں۔ جرمنی واپس جانے سے قبل آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ ان کے علاوہ کئی کتابیں اس وقت پریس میں ہیں۔ انشاء اللہ اسی سال چھپ کر آجائیں گی۔"

"قریشی صاحب یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے بس استاد کی یہی دولت ہے۔ اس کو علمی اور تحقیقی کام میں اپنے آپ کو مصروف رکھنا چاہیئے۔ وقت ضائع کرنے اور غیر علمی باتوں میں اپنے آپ کو الجھانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "یہ سب کچھ میں نے آپ سے اور اپنے محترم اساتذہ سے سیکھا ہے۔"

دوران گفتگو انہوں نے برلن یونیورسٹی کا حال سنایا کہنے لگے "میں تو تعطیلات میں کچھ وقت گذارنے کے لئے جرمنی گیا تھا۔ اپنی یونیورسٹی میں گیا، پروفیسروں سے ملا، عربی اور اسلامیات کے صدر شعبہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے عربی اور اسلامیات کی پروفیسری آفر کی۔ میں نے اس کو قبول کر لیا، اور اب میں وہاں بڑے سکون اور اطمینان سے کام کر رہا ہوں۔ ہفتے میں دو تین لیکچر دیتا ہوں۔ باقی وقت میں تحقیق کا کام کرتا ہوں۔ اچھا وقت گذر رہا ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو بہت اچھا ہوا کہ آپ اب اپنی ہی یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔"

خاصی دیر تک باتیں کرنے کے بعد میں نے ان سے اجازت لی۔ تعطیلات کے بعد پروفیسر صاحب واپس برلن چلے گئے، اور پھر وہاں سے اس سفر پر روانہ ہو گئے جہاں سے کوئی کبھی لوٹ کر واپس نہیں آتا۔

Marfat.com

Marfat.com

ڈاکٹر صابر علی خاں

اورنٹیل کالج میں مجھے آئے ہوئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے کہ ایک دن ایک صاحب اسٹاف روم میں داخل ہوئے، اور عربی کے استاد مولانا نورالحسن خاں صاحب کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں اس وقت ایک کونے میں پردے کے پیچھے بیٹھا ہوا کسی کام میں مصروف تھا۔ کام سے فارغ ہوا تو مولانا کی دلچسپ باتیں سُننے کے لئے اُن کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

مولانا نے صابر علی خان سے تعارف کروایا، اور کہا کہ "صابر صاحب میرے بہت پُرانے دوست ہیں۔ یہ سیّد عبداللہ صاحب کے بھی یار دیرینہ ہیں۔ نصف صدی سے لاہور میں ہیں۔ یہیں اورنٹیل کالج میں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ سید صاحب کے کلاس فیلو ہیں۔ منشی فاضل میں یہ لوگ ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر یہ ام۔اے کرنے کے لئے علی گڑھ چلے گئے۔ اب پنجاب یونیورسٹی سے اُردو میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ لڑکیوں کے کوئین میری کالج لاہور میں اُردو پڑھاتے ہیں۔ بڑے شفیق اُستاد اور مخلص دوست ہیں۔ صبح دوپہر اور شام کونگینہ بیکری میں ضرور آتے ہیں۔ ان کے دم سے وہاں رونق رہتی ہے"۔

مولانا نے اپنے مخصوص دلچسپ انداز میں صابر علی خاں صاحب کے بارے میں بہت کچھ بلکہ سب کچھ بتا دیا۔ خاصا مفصل تعارف ہوا۔

صابر علی خاں صاحب اپنے بارے میں یہ سب کچھ سنتے رہے لیکن کچھ بولے نہیں صرف

Marfat.com

اتنا کہا کہ اورینٹل کالج میں آپ کے آنے کی خبر سُنی تھی، اور سُن کر جی خوش ہوا تھا شکر ہے کہ آپ آ گئے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مجھے ضرور بتایئے۔ میں پچاس سال سے لاہور میں ہوں اور اس شہر کے مزاج سے پوری طرح آشنا ہوں۔ بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ اس لئے میں اس شہر کو اس یونیورسٹی کو اور اورینٹل کالج کے ماحول کو خوب سمجھتا ہوں"۔

یہ باتیں صابر علی خاں صاحب نے بڑے دھیمے انداز میں بلکہ خاموشی کے ساتھ رازدارانہ انداز میں کیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ ڈرے ہوئے اور سہمے ہوئے سے ہیں۔ کھُل کر بات کرنا اُن کے مزاج میں نہیں ہے۔

میں نے کہا آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپ کا غائبانہ تعارف تویت صاحب نے کروایا تھا، میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ سے ملاقات بھی ہو گئی"۔

صابر صاحب میری یہ باتیں سُن کر چُپ رہے۔ ایک لفظ نہیں بولے لیکن ان کے انداز سے یہ معلوم ہوا کہ بہت خوش ہیں۔

ڈاکٹر صابر علی خاں سرخ سفید رنگ کے آدمی تھے، چہرے پر خشخاشی داڑھی، بال سفید، اور چہرے مہرے سے روہیل کھنڈ کے پٹھان معلوم ہوتے تھے۔ جسم پر علی گڑھ کٹ کا پاجامہ اور شیروانی، اور سر پر قراقلی کی سیاہ رنگ کی، اونچی دیوار کی ٹوپی، — پہلی بار اُن کو اس وضع قطع کے ساتھ دیکھا اور مرتے دم تک ان کی اس وضع میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ ہمیشہ اسی انداز اور وضع قطع سے مخصوص سانچے میں ڈھلے ڈھلائے نظر آئے۔

اس زمانے میں ڈاکٹر صابر علی خاں نگینہ بیکری کے قریب ایک تنگ گلی کے چھوٹے سے مکان کی دوسری منزل میں رہتے تھے۔ صبح کو وہ فجر کے وقت اٹھتے، نماز پڑھتے، ناشتہ کرتے، اپنی سائیکل نکالتے، بیکری میں حاضری دیتے اور پھر کوئین میری کالج چلے جاتے۔ لڑکیوں کو پڑھاتے۔ دو تین بجے واپس آتے۔ بیکری میں اپنی صورت دکھاتے اور پھر گھر چلے جاتے۔ شام کو اطمینان سے نگینہ بیکری میں بیٹھتے، احباب سے باتیں کرتے اور چائے پیتے۔ مغرب کے وقت تک وہ بیکری میں بیٹھتے، پھر گھر جا کر نماز پڑھتے، اور پھر بیکری میں واپس آتے۔ کبھی کبھی انارکلی بازار کا چکر لگاتے۔ غرض اُن کی زندگی گھر، کالج، نگینہ بیکری اور انارکلی تک محدود تھی اور وہ خوش رہتے تھے،

Marfat.com

طمانیت اُن کے ایک ایک انداز میں اپنا جلوہ دکھاتی تھی۔

اورنٹیل کالج اُن کا پُرانا کالج تھا۔ انہوں نے یہیں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس لئے کبھی کبھی فرصت کے اوقات میں اورنٹیل کالج ضرور آتے تھے۔ اس کالج سے انہیں بڑی محبت تھی۔ ڈاکٹر عبداللہ اُن کے کلاس فیلو تھے۔ اکثر اُن کے کمرے میں جاتے اور راز کی باتیں کرتے تھے۔ اسٹاف روم میں بھی اکثر بیٹھتے تھے، اور اساتذہ سے باتیں کرتے تھے۔ مولانا نورالحسن خاں صاحب سے اُن کی گہری دوستی تھی۔ دونوں پیٹھ پیچھے بھی ایک دوسرے کی تعریفیں کرتے تھے۔

اُس زمانے میں اورنٹیل کالج سے اُن کا ایک تعلق یہ بھی تھا کہ وہ سعادت یار خاں رنگین پر پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب اُن کے نگراں تھے۔ اس لئے اُن کے پاس بھی اکثر بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ دو تین سال میں اُن کا مقالہ مکمل ہوگیا، اور انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری مِل گئی۔ مقالہ انہوں نے خاصی محنت سے لکھا۔ ممتحنوں نے اُن کی تعریف کی، اور بائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس مقالے کو انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع بھی کر دیا۔ رنگین پر یہ پہلی کتاب تھی جو شائع ہوئی۔ ڈاکٹر صابر علی خاں اس کی اشاعت سے بہت خوش ہوئے۔

وہ چاہتے تو اس علمی کام کی وجہ سے اورنٹیل کالج میں بھی اُستاد کی حیثیت سے آسکتے تھے۔ کیونکہ ڈاکٹر عبداللہ سے اُن کی دوستی تھی۔ لیث صاحب اُن کے خیرخواہ تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ کوئین میری کالج کے ماحول سے وہ بہت خوش تھے۔ اس کالج کی انگریز پرنسپل اُن سے بہت خوش تھی۔ اُس کے انگلستان واپس جانے کے بعد ایک پاکستانی خاتون اس کالج کی پرنسپل ہوئیں۔ وہ بھی صابر صاحب کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ اُن کی شاگرد لڑکیاں بھی ان سے بہت مانوس تھیں۔ پاکستان کے مختلف علاقوں سے اچھے خاندانوں کی لڑکیاں اس کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آتی تھیں۔ ڈاکٹر صابر علی خاں نہایت شفیق اُستاد تھے۔ اس لئے وہ اُن کو نہ صرف اپنا استاد بلکہ بزرگ اور باپ سمجھتی تھیں۔ اپنی ساری زندگی انہوں نے اسی کالج میں گذار دی۔

ویسے وہ تھے اورنٹیل کالج کی روایت کے آدمی۔ انہوں نے شاداں بلگرامی صاحب اور حافظ محمود خاں شیرانی صاحب کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا۔ امتیاز علی خاں عرشی،

Marfat.com

ڈاکٹر عندلیب شادانی ڈاکٹر سید عبداللہ اورنٹیل کالج میں اُن کے ہم عصر تھے۔ اِن حضرات کی صحبتوں میں صابر صاحب کا مزاج علمی بن گیا، اور وہ اورنٹیل کالج کے علمی ماحول اور پنجاب یونیورسٹی کے معاملات میں دلچسپی لینے لگے کئی اہم کمیٹیوں اور بورڈوں کے ممبر بھی رہے۔ وہ مشرقی علوم اورنٹیل کالج اور اُردو کے بہی خواہ تھے، اور اِن کے فروغ کے لئے کام کرتے رہتے تھے۔

میں جب شروع شروع اورنٹیل کالج میں آیا تو یہاں کے ماحول سے بالکل ناآشنا تھا۔ صابر علی خاں صاحب نے مجھے اورنٹیل کالج، اس کی روایت، اس کے ماحول، اُس کے قدیم و جدید اساتذہ، اُن کی اچھائیوں، اُن کی خامیوں اور کمزوریوں کے بارے میں معلومات بہم پہنچائی۔ گھنٹوں انہوں نے اِن پہلوؤں پر مجھ سے باتیں کیں، جن کے نتیجے میں میں یہاں کے ماحول سے پوری طرح آشنا ہو گیا۔

ڈاکٹر صابر علی خاں بڑے ہی جہاں دیدہ آدمی تھے۔ تقریباً نصف صدی کا زمانہ انہوں نے لاہور میں گذارا تھا۔ اس لئے یہاں کے ماحول سے خوب واقف تھے۔ ہر شخص اُن کا دوست تھا کیونکہ وہ نہایت مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے۔ ہر ایک سے خوشگوار تعلقات رکھتے تھے۔ کسی سے اختلاف نہیں کرتے تھے۔ ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ لیکن ہر ایک کے بارے میں نہایت صائب رائے رکھتے تھے۔ مُثبت رائے کا تو اپنے مخصوص طریقے سے اظہار کر دیتے تھے لیکن منفی رائے کو دل میں چھپائے رکھتے تھے۔ مجھے ہمیشہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُنہوں نے ایک نقاب اوڑھ رکھی ہے۔ وہ پٹھان تھے لیکن پٹھانوں والی خصوصیات اُن میں نہیں تھی۔ یعنی نہ تو وہ کسی سے اختلاف کر سکتے تھے نہ لڑ جھگڑ سکتے تھے، نہ دوٹوک بات کرنے کی اُن میں صلاحیت تھی۔ البتہ دوستوں کے دوست تھے۔ اُن پر وہ جان بھی نثار کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اُن کی مدد کرتے تھے، اُن کے ساتھ حد درجہ اخلاص کے ساتھ پیش آتے تھے، اور اُن کی بہتری کے لئے ہر وقت کوشاں و سرگرداں نظر آتے تھے۔

میں اُن کے ایسے ہی دوستوں میں سے ایک تھا۔ مجھ پر اُن کی شفقت اور محبت بے پایاں تھی۔ اورنٹیل کالج اور نگینہ بیکری میں اکثر ملتے رہتے تھے لیکن یہاں کھل کر بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ کیونکہ کوئی نہ کوئی موجود ہوتا تھا۔ کوئی موجود نہیں بھی ہوتا تب بھی وہ کھلتے نہیں

Marfat.com

تھے۔ کہتے تھے "دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ احتیاط ضروری ہے۔ خاص طور پر اس ماحول میں جس میں ہم لوگ رہتے ہیں۔ لوگ اِدھر کی اُدھر بہت کرتے ہیں۔ لگائی بجھائی یہاں بہت ہے۔ ذرا سی بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے اور پریشانی کا باعث بنتی ہے۔ لوگ خواہ مخواہ دشمن ہو جاتے ہیں، اور بیخ کنی کرتے ہیں، نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہاں کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے"۔

اور مجھے اُن کی یہ باتیں سُن کر یہ احساس ہوتا تھا جیسے ہم کسی سُراغ رسانی کے ماحول میں رہ رہے ہیں۔ یہ باتیں میرے مزاج کے خلاف تھیں۔ میں تو دوٹوک بات کرنے والا آدمی تھا۔ کسی سے کوئی بات چھپاتا نہیں تھا۔ کسی کی لگی لپٹی نہیں رکھتا تھا۔ کوئی غلط بات کرے تو اس سے دو دو ہاتھ بھی ہو جاتے تھے۔ جوانی کا زمانہ تھا، اس لئے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ مزاج میں خاصی تیزی اور تندی تھی۔ صابر علی خاں صاحب کو میرے مزاج کی اس کیفیت کا علم تھا۔ اس لئے وہ مجھ سے اس قسم کی باتیں کچھ زیادہ ہی کرتے تھے۔ دراصل مجھے سیدھے راستے پر چلانا اُن کے پیش نظر تھا۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے "آپ کسی دن میرے غریب خانے پر آیئے۔ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے"۔

میں نے کہا "میں شام کو اِدھر ضرور آتا ہوں۔ آپ کے ہاں حاضر ہو جاؤں گا"۔

چنانچہ ایک دن شام کو میں نگینہ بیکری میں آیا تو وہ مجھے بجائے وہاں چائے پلانے کے اپنے گھر لے گئے۔ بیکری کے قریب ہی ایک گلی میں رہتے تھے۔ چھوٹا سا مکان تھا لیکن بہت صاف ستھرا تھا۔ صابر صاحب نے چند منٹ میں چائے کا اہتمام کیا۔ طرح طرح کی خانہ ساز چیزیں چائے کے ساتھ رکھیں۔ خود کچھ نہیں کھایا۔ مجھے اصرار کر کے کھلاتے رہے، اور اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتے رہے۔

پوچھنے لگے "آپ کو اورینٹل کالج کا ماحول کیسا لگا؟"

میں نے کہا "وہاں گھٹن اور منافقت بہت ہے۔ یونیورسٹی کی سی فضا نہیں ہے"۔ کہنے لگے "ابھی تو آپ نئے نئے یہاں آئے ہیں۔ اس لئے آپ کو اجنبیت کا احساس ہو رہا ہے کچھ وقت

Marfat.com

گذرے گا تو آپ کا جی لگ جائے گا۔ جم کر رہیئے۔ کسی کی پرواہ نہ کیجیے۔ اپنا کام کرتے رہیئے۔ لڑائی جھگڑے یہاں بہت ہیں۔ اس لئے احتیاط ضروری ہے۔ منافقت آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"

میں نے کہا "میں صاف گو آدمی ہوں۔ میرے دل میں جو ہوتا ہے وہ زبان پر آجاتا ہے۔ اپنے اس مزاج کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میری رگوں میں خون ہی کچھ ایسا ہے۔"

کہنے لگے "اپنے آپ کو تھوڑا سا بدلیئے۔ کسی کو اپنے دل کی بات نہ بتایئے۔ ابھی تو آپ کو یہاں تیس چالیس سال گذارنے ہیں انشاءاللہ آپ یہاں پروفیسر اور پرنسپل بھی ہوں گے۔ یونیورسٹی اور کالج کی سطح پر آپ کو بہت سی لڑائیاں لڑنی ہوں گی۔ ان سے مفر ممکن نہیں۔ یہاں ماحول یہی ہے۔ اس کے لئے ابھی سے تیاری کرنی چاہیئے۔ مزاج کو کسی حد تک بدلنا یہاں رہنے کے لئے ضروری ہے"

اور میں اُن کی یہ باتیں چُپ چاپ سُنتا رہا۔

پھر کہنے لگے "یونیورسٹی کے کیلنڈر کا مطالعہ کرتے رہیئے۔ اکثر مواقع پر آپ کو اس کی ضرورت پیش آئے گی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں یونیورسٹی تک پہنچتی ہیں، آپ کو اپنی جگہ بنانے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ کیلنڈر ضرور پڑھتے رہیئے، بلکہ اس کے ضروری حصّوں کو حفظ کر لیجیے۔"

میں نے کہا "چند مہینے میں میں نے حالات کو بڑی حد تک سمجھ لیا ہے۔ انشاءاللہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔"

صابر صاحب کہنے لگے "میں یہاں کے ماحول کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ پچاس سال سے یہاں عجب عجب تماشے دیکھ رہا ہوں۔ اس لئے سوچا آپ کو یہاں کے ماحول کی صحیح کیفیت سے آگاہ کر دوں۔"

اُن کی باتوں میں بڑا خلوص تھا، اس لئے میں نے اُن کے مشوروں کو گرہ میں باندھا، اور کوئی دو گھنٹے تک اُن سے باتیں کر کے وہاں سے رُخصت ہوا۔

یہ ڈاکٹر صابر علی خاں صاحب سے میری پہلی تفصیلی مُلاقات تھی۔

میں تقریباً تیس سال اورینٹل کالج میں رہا، اور یہاں مجھے عجیب و غریب تجربات ہوئے۔ صابر صاحب کے مشورے ہمیشہ میرے کام آئے۔ اور ان مفید مشوروں کی وجہ سے میرے اندر سا نگار

Marfat.com

حالات ۔۔۔ مطابقت پیدا کرنے کی سکت پیدا ہوئی، اور میں ہمیشہ کامیاب ہوا۔

ڈاکٹر صابر علی خاں نگینہ دھام پور کے رہنے والے تھے۔ موسم گرما کی تعطیلات ہمیشہ اپنے عزیزوں کے ساتھ اپنے آبائی وطن میں گذارتے تھے۔ جانے سے پہلے ہمیشہ مجھ سے گھر پر ملنے آتے تھے، اور کہتے تھے میں ہندوستان جا رہا ہوں۔ کوئی کام ہو تو میرے سپرد کیجیے۔ کوئی چیز وہاں سے منگوانا ہو تو بے تکلفی سے مجھے بتائیے"۔

اور میں ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ "خاں صاحب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ہر چیز یہاں مل جاتی ہے۔ کام بھی کوئی نہیں ہے"۔

لیکن خدا جانے کس طرح وہ معلوم کر لیتے تھے کہ میں ہندوستان کے پان، وہاں کے ناریل اور پاپڑ پسند کرتا ہوں۔ چنانچہ جب تعطیلات گذار کر وہ لاہور واپس آتے تو میرے لئے یہ تمام چیزیں ضرور لاتے، اور بڑی محبت سے گھر پر خود پہنچاتے۔ بڑی محبت کے آدمی تھے۔

عید کے موقع پر ایک دن قبل اُن کا کوئی آدمی آتا، اور اُن کے خط کے ساتھ مٹھائی کا ایک ڈبہ عطر اور تیل ضرور لاتا۔ خط میں وہ لکھتے کہ "عید کا یہ تحفہ قبول فرمائیے"۔ مرتے دم تک اُن کے اس معمول میں فرق نہیں آیا۔

ایک زمانے تک صابر صاحب سواری کے لئے سائیکل استعمال کرتے تھے۔ اپنی مخصوص وضع قطع کے ساتھ وہ سائیکل پر نظر آتے تھے، اور لاہور میں جہاں بھی جاتا ہوتا تھا اپنی سائیکل پر وہاں پہنچ جاتے تھے۔ آخری زمانے میں جب انہوں نے انارکلی کا مکان چھوڑ دیا اور وہاں سے چار پانچ میل کے فاصلے پر سوڈی وال میں اپنا مکان بنا لیا تو سائیکل چلانی مجبوراً چھوڑ دی اور انہوں نے ایک ہلکی سی موٹر سائیکل خرید لی۔ کئی سال تک وہ لاہور میں اس موٹر سائیکل پر سفر کرتے رہے۔ مرتے دم تک یہ موٹر سائیکل اُن کے پاس رہی۔ یہ دونوں سواریاں انہوں نے صرف اس لئے استعمال کیں کہ وہ اُن کے احباب کے گھروں تک آسانی سے پہنچا دیتی تھیں۔ اور تحفے، تحائف لے کر احباب کے گھروں تک پہنچنا صابر صاحب کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ وہ احباب سے محبت کرتے تھے، اور مختلف طریقوں سے اس محبت کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ یہ موٹر سائیکل انہوں نے اسی مقصد کے لئے خریدی تھی۔ موٹر سائیکل چلانی انہیں نہیں آتی

Marfat.com

تھی۔سن ساٹھ سال سے اوپر ہو چکا تھا۔اس عمر میں موٹر سائیکل سیکھنا اُن کے لئے مشکل تھا۔ بہرحال وہ موٹر سائیکل ضرورت کے تحت چلاتے تھے۔سائیکل اُن سے چلتی نہیں تھی۔ ٹریفک بھی بہت بڑھ گیا تھا۔اس لئے سائیکل چلانا خطرناک بھی تھا۔اس لئے انہوں نے موٹر سائیکل چلانے کا فیصلہ کیا۔بہت آہستہ ڈر ڈر کر چلاتے تھے۔وہ خود بھی ڈرتے تھے، اور جہاں سے گذرتے تھے، وہاں آس پاس کے لوگ بھی اُن کی موٹر سائیکل سے ڈرتے تھے۔ کئی دفعہ انہیں حادثے بھی پیش آئے۔چوٹیں بھی لگیں لیکن موٹر سائیکل کو انہوں نے خیرباد نہیں کہا کیونکہ احباب سے مِلنے جُلنے اور اُن کے کام کرنے کے لئے موٹر سائیکل بہت مفید ثابت ہوتی تھی۔

ڈاکٹر صابر علی خاں صاحب کی زندگی عزیزوں اور دوستوں کی خدمت کے لئے وقف رہی۔جو عزیز اُن کے پاکستان میں تھے، اُن کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ہر ایک کا وظیفہ بندھا ہوا تھا۔مختلف طریقوں سے کچھ نہ کچھ انہیں بھیجتے رہتے تھے۔اور جو عزیز ہندوستان میں رہ گئے تھے، اُن کی بھی مختلف طریقوں سے مدد کرتے رہتے تھے۔وہاں بھی مستحق عزیزوں کو کچھ نہ کچھ رقم پہنچتی رہتی تھی۔اور اُن کے جو دوست تھے، اُن کے ساتھ بھی اُن کا یہی رویّہ تھا۔

وہ ایک شفیق اُستاد تھے۔تقریباً چالیس سال انہوں نے کوئین میری کالج میں لڑکیوں کو پڑھایا، اور علم و ادب کے صحیح ذوق و شوق کے ساتھ اُن کو تہذیب اور شائستگی کی دولت سے بھی مالامال کیا۔وہ اپنی ایک ایک طالب علم کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ہر ایک کے خاندانی اور ذاتی حالات کا بھی انہیں علم تھا۔یہ طالبات اُن کی بہت عزت کرتی تھیں اور انہیں اپنے باپ کی جگہ سمجھتی تھیں۔اُن کے معمولی سے معمولی مسائل کو بھی صابر صاحب حل کر دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ پرنسپل اور اساتذہ بھی اُن کا بہت احترام کرتی تھیں، اور وہ بھی ان سب کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔

ڈاکٹر صابر علی خاں صاحب کا علمی ادبی ذوق بھی بہت اونچے درجے کا تھا۔خاص طور پر کلاسیکی ادب کے مطالعے سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔اسی دلچسپی نے انہیں مرزا سعادت یار خاں رنگین پر پی ایچ ڈی کا کام کرنے کے لئے آمادہ کیا۔کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد ان کا

Marfat.com

یہ کام مکمل ہوا، اور پنجاب یونیورسٹی نے انہیں اس تحقیقی مقالے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔ یہ کام اُنھوں نے ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صاحب کی نگرانی میں کیا۔ بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اُن کے اس مقالے کو پسند کیا اور انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان کی طرف سے اس کو نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ اُن کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ شاید اس لئے کہ اس سے قبل رنگین پر کوئی کام نہیں ہوا تھا آج بھی اُن کی یہ کتاب مُنفرد حیثیت رکھتی ہے، اور سعادت یار خاں رنگین اور اس کے عہد سے دلچسپی رکھنے والے آج بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ لیکن انہیں اپنی اور اپنی اس کتاب کی اہمیت کا بالکل احساس نہیں تھا۔ جب بھی اُن کے سامنے اس کا ذکر کیا جائے تو وہ کچھ پریشان سے ہوتے بلکہ شرما جاتے تھے۔ انہیں اپنی تعریف پسند نہیں تھی۔

ڈاکٹر صابر علی خاں نہایت سادہ اور معصوم آدمی تھے۔ نمود و نمائش سے انہیں نفرت تھی۔ وہ بڑے ہی مخلص اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ اُن کی زندگی خدمتِ خلق کے لئے وقف تھی۔ وہ بڑے انسان دوست آدمی تھے، اور ہر ایک کی خدمت کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اُن کا علم اور تجربہ بھی بہت تھا۔ وہ زمانے کی مزاج دانی کا گہرا شعور بھی رکھتے تھے، اپنے شاگردوں، دوستوں اور عزیزوں کو نہایت صائب مشورے دیتے تھے، اور اُن کی زندگیوں کو بنانے سنوارنے اور ان کو سکون و اطمینان سے ہم کنار کرنے میں اُن کا جواب نہیں تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اُن کی یاد بے شمار لوگوں کے دلوں میں آج بھی ستاروں کی طرح جھلملاتی ہے، اور آفتاب و ماہتاب بن کر اُن کی شخصیتوں کو رنگ و نُور کی دلنشیں مُسکراہٹوں سے آشنا کرتی ہے۔

Marfat.com

Marfat.com

میاں مہردین

آج سے تقریباً چالیس سال قبل، جب میں ایک اجنبی کی حیثیت سے، یونیورسٹی لا رکالج کو پار کر کے، مینارڈ ہال سے گذر کر اورینٹل کالج کی عمارت میں داخل ہوا تو جو شخص مجھے سب سے پہلے نظر آیا، وہ مجھے بہت ہی نستعلیق آدمی معلوم ہوا۔ میانہ قد، سانولا رنگ، سر پر پگڑی پاؤں میں معمولی سی چپل، سفید کرتے اور تنگ موری کے پاجامے میں ملبوس ——— یہ کالج کا پُرانا چپراسی میاں مہردین تھا۔

میں نے اس سے پوچھا "کیوں بھئی! اورینٹل کالج یہی ہے"؟

اُس نے جواب دیا "جی ہاں! یہی اورینٹل کالج ہے۔ آپ کس سے مِلنا چاہتے ہیں"؟

میں نے کہا "میں ڈاکٹر برکت علی قُریشی اور ڈاکٹر عبداللہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ ذرا بتایئے وہ کہاں ملیں گے"؟

مہردین نے کہا "آپ میرے ساتھ تشریف لایئے"۔

یہ کہہ کر وہ مجھے صدر دروازے سے کالج کے اندر لے گیا، اور گیلری میں پہنچ کر کہا "ڈاکٹر قُریشی صاحب تو آج کل ملک سے باہر ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ اس وقت تشریف رکھتے ہیں۔ سامنے اُن کا کمرہ ہے۔ میں انہیں اطلاع کر دیتا ہوں۔ جناب کا اسم گرامی"؟

میں نے کہا "میرا نام ڈاکٹر عبادت ہے۔ آج ہی لاہور آیا ہوں۔ ڈاکٹر عبداللہ سے ضروری کام ہے۔ شکر ہے کہ وہ اس وقت کالج میں موجود ہیں"۔

Marfat.com

یہ سُن کر وہ ڈاکٹر عبداللہ کے کمرے میں گیا، اور اُنہیں میرے آنے کی اطلاع دی۔ تو وہ خود باہر تشریف لے آئے، اور بڑی محبت اور احترام کے ساتھ مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔ مجھے اپنے قریب بٹھایا اور حال احوال پوچھنے لگے۔ دیر تک اُن سے باتیں ہوتی رہیں۔

اس عرصے میں مہر دین چائے لے آیا، اور نہایت سلیقے سے اس نے چائے بنا کر ہم لوگوں کے سامنے رکھی، اور پھر آہستہ سے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر چلا گیا۔

اُس کی تہذیب، شائستگی، وضع داری اور سلیقہ شعاری کو دیکھ کر میں نے ڈاکٹر عبداللہ سے پوچھا "یہ کون شخص ہے؟"

ڈاکٹر عبداللہ نے کہا "یہ کالج کا بہت پُرانا چپراسی مہر دین ہے۔ دفتر کے لوگ اور اس کے رفقا اس کو میاں صاحب یا میاں مہر دین کہتے ہیں۔ اچھے لوگوں میں رہا ہے۔ اچھا زمانہ اس نے دیکھا ہے۔ نہایت مہذّب، شائستہ، سلیقہ شعار، اور دیانت دار آدمی ہے۔ اس نے پروفیسر ڈوسن، پروفیسر شفیع، پروفیسر لکشمن سروپ اور پروفیسر اقبال کے زمانے دیکھے ہیں۔ کالج سے اس کو بڑی محبت ہے۔ کالج ہی اس کی دُنیا ہے۔ صبح سے شام تک یہیں رہتا ہے۔ ہر ایک کا کام کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ سب اس کی عزّت کرتے ہیں۔ خوب آدمی ہے"۔

سیّد صاحب نے مہر دین کا جس طرح تعارف کرایا، اور جن الفاظ میں اس کی تعریف کی، اس سے میں بہت متاثر ہوا۔

میں نے اورینٹل کالج میں بہ حیثیت پروفیسر اور پرنسپل تقریباً تیس بتیس سال گذارے۔ اس عرصے میں مہر دین سے میرا رابطہ رہا، اور میں نے اس کو نہایت وضع دار، شائستہ، مُستعد، ہمدرد مُخلص، سمجھ دار، ذہین، باشعور اور دیانت دار پایا۔

اورینٹل کالج کے علاوہ مہر دین کی کوئی اور زندگی نہیں تھی۔ صبح کو کالج کے وقت سے بہت پہلے وہ کالج میں اُس وقت آجاتے تھے جب وہاں کوئی نہیں ہوتا تھا۔ دفتر کی صفائی وہ خود کرتے تھے۔ پھر ایک ایک کمرے کو جا کر یہ دیکھتے تھے کہ صفائی ٹھیک طرح ہوئی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد پانی کا انتظام دیکھتے تھے۔ اس کے بعد اورینٹل کالج میگزین کے اسٹور اور مطبوعات کے اسٹور کی دیکھ بھال اور صفائی کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ پھر وہ دفتر کے کاغذات یونیورسٹی لے

Marfat.com

جاتے تھے۔ بینک کا کام بھی کرتے تھے۔ میگزین کی چھپائی کے سلسلے میں پریس بھی جاتے تھے۔ اس طرح تقریباً آدھا دن گذر جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اساتذہ کا کام بھی کرتے تھے۔ کسی کے پرچوں کا پارسل بنا رہے ہیں۔ کسی کی رجسٹریاں لے کر ڈاک خانے جا رہے ہیں۔ کسی کے لئے بینک سے پیسے نکال کر لا رہے ہیں۔ کسی کے کام سے انارکلی جا رہے ہیں۔ غرض دن بھر وہ اس طرح کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ کبھی کسی کے کام کو ٹالتے نہیں تھے۔ ناک بھوں نہیں چڑھاتے تھے۔ برخلاف اس کے نہایت خندہ پیشانی سے یہ تمام کام انجام دیتے تھے۔ بڑی بات یہ تھی کہ اِن کاموں کے صلے میں کسی سے کوئی خواہش یا منفعت کا خیال اُن کے دل میں نہیں ہوتا تھا۔

بات یہ ہے کہ مہر دین کو اورینٹل کالج کی ہر چیز عزیز تھی۔ اساتذہ کے ذاتی کاموں تک کو وہ کالج کا کام سمجھتے تھے۔ کیونکہ بہرحال ان اساتذہ کا تعلق کالج سے تھا۔ طالب علموں کو بھی عزیز رکھتے تھے، اور اُن کے کام بھی کر دیتے تھے۔ اس لئے کہ وہ کالج کے طالب علم تھے۔ پہلی تاریخ کو اُن کا دن بینک میں گذرتا تھا۔ یونیورسٹی سے دفتر کے عملے اور اساتذہ کی تنخواہوں کے جو چک آتے تھے، اُن کی رقم بینک سے لے کر کالج میں آتے تھے، اور خود تقسیم کرتے تھے برسوں انہوں نے یہ کام کیا، اور کبھی حساب میں ایک پائی کا فرق نہیں آیا۔ زیادہ پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے، لیکن حساب کتاب پروفیسروں سے کچھ زیادہ ہی جانتے تھے۔ کم از کم میرا حساب تو اُن کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ کیونکہ مجھے حساب کتاب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ باقاعدگی اور دیانت داری مہر دین پر ختم تھی۔

مہر دین نے قیام پاکستان سے قبل کے بڑے بڑے پروفیسروں کے ساتھ وقت گذارا اور قیام پاکستان کے بعد بھی کالج کے اساتذہ کے ساتھ اُن کا تعلق رہا۔ وہ اساتذہ کی بڑی عزت کرتے تھے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ہر ایک سے انہیں محبت تھی۔ وہ اُن کے کمروں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اسٹاف روم کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے، اور اساتذہ کی خدمت کرنا اور ان کو سکون و اطمینان بہم پہنچانا اُن کی زندگی کا نصب العین تھا۔

قیام پاکستان سے قبل ڈاکٹر لکشمن سروپ سنسکرت کے پروفیسر اور اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے۔ دوسری منزل پر زینے کے ساتھ اُن کا کمرہ تھا۔ اس کمرے میں اُن کی ذاتی لائبریری بھی

Marfat.com

تھی۔اس لائبریری میں سنسکرت اور قدیم ہندوستان کی تاریخ اور زبانوں کے بارے میں بہت اچھا سلکشن تھا۔ان کے علاوہ مغربی ادبیات پر بھی کتابوں کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔یہ کتابیں ڈاکٹر صاحب نے اپنے قیام انگلستان کے زمانے میں آکسفورڈ اور لندن میں خریدی تھیں۔تقسیم ہند سے قبل ڈاکٹر لکشمن سروپ کا انتقال ہوگیا۔پھر تقسیم کے نتیجے میں دُنیا ادھر سے اُدھر ہوگئی۔لیکن ان کی یہ کتابیں اسی کمرے میں محفوظ رہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اورینٹل کالج کے نئے دور میں کچھ نئے اساتذہ اس کمرے میں بیٹھنے لگے تھے۔ایک دن بعض اساتذہ کی نیت خراب ہوگئی، اور اُن میں سے بعض نے کہا کہ مسلمانوں کی کتابیں ہندوستان میں بہت لوٹی گئی ہیں۔اس لئے ان کتابوں پر ہمیں قبضہ کرلینا چاہیئے۔اتفاق سے اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا۔میں نے کہا "یہ کالج کے ایک پروفیسر اور پرنسپل کی کتابیں ہیں۔وہ اب اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ہمیں امانت سمجھ کر ان کتابوں کی حفاظت کرنی چاہیئے۔پروفیسر صاحب کی بیگم اور بچوں میں سے کبھی کوئی آئے گا تو اس کو دے دی جائیں گی۔اگر ہماری نیت خراب ہوئی تو ہم میں اور اس جاہل آدمی میں کیا فرق ہوگا جو کتابوں کو برباد کرتا ہے، ان کو جلاتا ہے۔"

لیکن میری یہ باتیں نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئیں۔بعض لوگوں نے تالے توڑ کر کچھ کتابیں نکالیں۔میں نے اس پر احتجاج کیا۔خبر پرنسپل تک پہنچی۔انہوں نے ان الماریوں میں پھر تالے لگوا دیئے، اور اس طرح یہ کتابیں محفوظ رہیں۔خیال تھا پروفیسر صاحب کی بیگم امرتسر سے لاہور آئیں گی تو اُن کے حوالے کر دی جائیں گی لیکن وہ نہیں آئیں، اس لئے میں نے کوشش کرکے ان کو پنجاب یونیورسٹی کے سنسکرت سکشن میں ان کے نام سے محفوظ کروا دیا۔

جب ان کتابوں پر بعض لوگوں کی رال ٹپکی تو سب سے زیادہ جس شخص نے غم اور غصے کا اظہار کیا وہ مہر دین تھے۔میں نے انہیں کئی دن تک مغموم دیکھا اور یہ کہتے ہوئے سُنا کہ "یہ کتابیں کالج کے سابق پرنسپل ڈاکٹر لکشمن سروپ کی ہیں۔ان کو امانت سمجھ کر محفوظ رکھنا چاہیئے۔کسی شخص کو کوئی حق نہیں کہ وہ اِن کتابوں کو ہاتھ لگائے۔کئی دن تک مہر دین مختلف طریقوں سے دبی زبان سے احتجاج کرتے رہے، اور جس کے نتیجے میں ڈاکٹر لکشمن سروپ کی الماریوں کو مُقفل کرکے ان کی کتابوں کو محفوظ کر دیا گیا۔

Marfat.com

مہردین میں انسانیت بہت تھی۔ مذہبی عصبیت اور سیاست سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو صرف انسان کو دیکھتے تھے اور اس کے علم اور منصب کو پہچان کر اس کی عزّت کرتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے بعض لوگوں کی مذموم حرکات پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ اُن کی انسانیت انسان دوستی، وضع داری، خلوص اور محبت نے اُن کے ہاں غم اور غصے کے جذبات کو ابھارا۔ جن لوگوں نے اس معاملے میں بدنیتی کا اظہار کیا تھا وہ ذلیل و رُسوا ہوتے اور مہردین کی عزّت اور وقار میں اضافہ ہوا۔

میاں مہردین بہت کتابیں دیکھتے رہتے تھے۔ زیادہ لوگوں سے بات نہیں کرتے تھے۔ پروفیسروں کے سامنے زبان بالکل نہیں کھولتے تھے۔ جو کام اُن کے سپرد کیا جاتا تھا وہ کر دیتے تھے۔ کام کو فرض سمجھ کر نہایت تن دہی اور سلیقے سے انجام دیتے تھے۔ کام کرنا اور سلیقے سے کام کو انجام دینا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ اسی کو وہ اپنا انعام سمجھتے تھے۔ کسی سے کچھ حاصل کرنا یا طلب کرنا اُن کے مزاج میں نہیں تھا۔ وہ طمانیت کے پتلے نظر آتے تھے۔ انہوں نے ہر طرح کی منفعت سے اپنے آپ کو بے نیاز کر لیا تھا۔ وہ درویشی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں نے ایسا بے نیاز شخص اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔

مہردین پروفیسر وولزا اور پروفیسر شفیع کے زمانے سے اورینٹل کالج میگزین کا کام کرتے تھے، اور انہیں میگزین فنڈ سے معمولی سا اعزازیہ ملتا تھا۔ جب میں کالج کا پرنسپل ہوا، اور اورینٹل کالج میگزین کا کام بھی میرے سپرد ہوا تو میں نے صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے اس کو خوبصورت اور باوقار بنانے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میگزین کا کام بہت بڑھ گیا۔ مہردین اس کام میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگے۔ جب میگزین چھپ کر آتا تو بہت خوش ہوتے۔ خود استادوں کو تقسیم کرتے۔ شہر کے ادیبوں اور دانش وروں کے پاس بھی خود ہی لے جاتے، اور داد وصول کرتے۔ مہردین کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اُن کے الاؤنس میں اضافہ ہونا چاہیئے۔ میں نے خود اُن سے پوچھے بغیر اُن کا الاؤنس دُگنا کر دیا۔ لیکن اس کا ذکر میں نے اُن سے نہیں کیا، اور نہ مہردین نے کبھی اس موضوع پر مجھ سے بات کی۔ کبھی کوئی اُن سے اس کا ذکر کرتا تو مُسکرا کر خاموش ہو جاتے بلکہ شرما تے۔ ایسے مواقع پر مجھے میر کا یہ شعر یاد آجاتا ہے

Marfat.com

جب کہا ہم میرے عاشق ہو تم
ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

مہر دین میں واقعی ایک عاشق کی خصوصیات موجود تھیں۔ انہیں اورینٹل کالج سے، اورینٹل کالج میگزین سے اور اورینٹل کالج کی مطبوعات سے عشق تھا۔ کالج کے اساتذہ کے علمی کاموں کے بھی وہ شیدائی تھے۔ انہیں ہر ایک پروفیسر کی مطبوعات کا علم تھا۔ کالج کی مطبوعات کو تو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ کالج میگزین اور مطبوعات کے گودام میں جو اسٹاک تھا، اس کا سوائے اُن کے کسی اور کو علم نہیں تھا۔ میگزین کے پُرانے پرچے انہوں نے بڑے سلیقے سے گودام میں رکھے تھے مطبوعات کو بھی اچھی طرح تاریخی ترتیب کے ساتھ محفوظ کیا تھا۔ پُرانی سے پُرانی چیز کی کسی کو ضرورت ہوتی تو مہر دین چند لمحوں میں نکال لاتے تھے، اور نہایت سلیقے سے پیش کر دیتے تھے۔ پیکنگ کا ہُنر بھی انہیں خوب آتا تھا۔ جو پیکٹ بھی بناتے تھے وہ اپنی مضبوطی اور حُسن کی وجہ سے دلوں کو موہ لیتا تھا۔

میں نے اپنی پرنسپلی کے زمانے میں اورینٹل کالج میگزین کے تمام پُرانے پرچوں کی سال سال بھر کی نہایت خوبصورت چمڑے کی جلدیں بنوا کر اسٹاف روم میں محفوظ کیں تو مہر دین اُن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اور اسٹاف روم میں یہ کہتے ہوئے سُنے گئے کہ ایک زمانے سے میری یہ خواہش تھی کہ ایسی جلدیں بنوا کر محفوظ کی جائیں۔ میں اس کا خواب دیکھتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے اس خواب کو حقیقت بنا دیا۔ اللہ تعالےٰ انہیں زندگی دے اور ہمیشہ خوش رکھے"!

لیکن مہر دین نے میرے سامنے کبھی کچھ نہیں کہا۔ کام کی بات کی اور چلے گئے۔ غالباً اُن کا یہ رویہ پرنسپل کے احترام کی وجہ سے تھا۔ اورینٹل کالج کے پرنسپل کی وہ اتنی عزت کرتے تھے کہ اس کے سامنے اُن کی زبان بند ہو جاتی تھی۔

ڈاکٹر محمد باقر صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد میں ۱۹۷۰ء میں اورینٹل کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ اُس وقت کسی اور شعبے میں کوئی اور پروفیسر نہیں تھا، صرف لکچرار تھے۔ اس لئے سب سے زیادہ سینئر یونیورسٹی پروفیسر ہونے کی حیثیت سے یونیورسٹی نے مجھے پرنسپل بنا دیا۔ میرے لئے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ لیکن اُردو کی پروفیسری اور شعبۂ اُردو کی صدارت کے ساتھ

Marfat.com

اورینٹل کالج کی پرنسپلی ایک بہت بڑی ذمہ داری تھی۔ میں نے اس بوجھ کو خندہ پیشانی سے اُٹھایا، اور اورینٹل کی روایت کو برقرار رکھنے بلکہ اُس کو آگے بڑھانے کے لئے اپنی سی پوری کوشش کی۔

مہر دین میرے پرنسپل ہونے سے بہت خوش ہوئے، اور اپنے مخصوص انداز میں دعائیں دیے کر اس خیال کا اظہار کیا کہ انشاء اللہ اورینٹل کالج ڈاکٹر صاحب کی پرنسپلی کے زمانے میں بہت ترقی کرے گا، اور اس کی شہرت دُنیا میں دور دور تک پھیلے گی۔ الحمدللہ کہ ان کی یہ دعا قبول ہوئی اور یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔

اس کا اندازہ مجھے اس طرح ہوا کہ پرنسپل ہونے کے دو سال بعد جب یونیورسٹی نے اورینٹل کالج کے جشن صد سالہ منانے کی ذمے داری میرے کاندھوں پر ڈالی تو میں نے دُنیا کی تمام اہم یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں اور پروفیسروں سے رابطہ قائم کیا، اور اُن میں سے بیشتر جشن صد سالہ میں شریک ہونے کے لئے اپنے خرچ پر لاہور آنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ اس جشن کو میں نے علوم مشرقی کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں رنگ دے دیا۔ اس کانفرنس میں امریکہ، روس، انگلستان، جرمنی، فرانس، اٹلی، ترکی، سعودی عرب، ایران اور افغانستان سے مندوب آئے، اور اس کے اجلاس ایک ہفتے تک سینٹ ہال میں ہوتے رہے۔ آکسفورڈ، کیمبرج، لندن، ڈرہم، اڈنبرا اور دوسری بہت سی یونیورسٹیوں سے پیغامات بھی آئے۔

اورینٹل کالج کے اس جشن اور بین الاقوامی کانفرنس کی وجہ سے اورینٹل کالج کی شہرت دور دور تک پھیلی اور اس کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ حکومت پاکستان نے بھی اس کو سراہا۔

میں نے اس کانفرنس اور جشن صد سالہ کی روداد، اور جو مقالے اس کے مختلف اجلاسوں میں پڑھے گئے، اُن سب کو دو ضخیم جلدوں میں نہایت اہتمام سے شائع کر دیا۔ اس کی جلدیں دُنیا کی تمام یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں اور علوم مشرقی کے پروفیسروں کو بھجوا دیں اور اپنے خرچ پر نہایت خوبصورت الماریاں بنوا کر اُن میں ان جلدوں کو کالج کے اسٹاف روم میں محفوظ کر دیا۔

مہر دین اس سے بہت خوش ہوئے، اور ابھی تک بغیر کسی کو بتائے ہوئے ان الماریوں اور ان جلدوں کی حفاظت کرتے ہیں، اور اس کام کو سراہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ اورینٹل کالج سے اُن کی محبت ہے۔

Marfat.com

میاں مہر دین کوئی خاص پڑھے لکھے آدمی نہیں تھے۔لیکن وہ پڑھنے لکھنے کا کام کرنے والوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی اورینٹل کالج کے علمی ماحول میں بسر کی جو اپنی علمی ادبی اور تحقیقی روایت کے لئے سارے جہان میں مشہور تھا۔انہوں نے ایسے ایسے پروفیسروں کو دیکھا تھا جو علمی کاموں کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھتے تھے، اور جس کی بدولت اُن کے علمی تحقیقی کاموں کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی تھی۔مہر دین کے دل میں ان اساتذہ کا بڑا احترام تھا۔جب بھی ان اساتذہ کی کوئی نئی کتاب چھپ کر آتی تھی تو مہر دین بہت خوش ہوتے تھے، اور جاننے والوں سے اس کا تذکرہ کرتے اور اس کی داد دیتے تھے۔

داد دینے کے اُن کے کچھ اور بھی طریقے تھے۔

ایک دن صبح کو میں ذرا جلدی کالج پہنچ گیا۔غالباً اس وقت آٹھ بجے تھے۔کالج میں لکچر کا وقت نو بجے تھا۔مہر دین پرنسپل کے کمرے کو صاف کر رہے تھے۔کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے ہوئے تھے۔چک اُٹھی ہوئی تھی۔مہر دین کمرے کی چیزوں کو صاف کرتے جاتے تھے، اور میری ایک نئی مطبوعہ کتاب (غالباً غزل اور مطالعۂ غزل) کو اُٹھا کر کبھی سر پر رکھتے کبھی دونوں ہاتھوں میں لے کر اُس کو بلند کرتے اور پھر میز پر رکھ دیتے۔

میں نے کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے موٹر روک کر اس منظر کو دیکھا، اور مہر دین کے جذب و جنوں کی اس کیفیت سے بہت محظوظ ہوا۔مہر دین کو اس کی خبر نہیں ہوئی۔

پروفیسروں، خصوصاً لکھنے پڑھنے والے پروفیسروں کو حساب کتاب نہیں آتا۔پیسے تک گننا نہیں آتے۔مہر دین ایسے پروفیسروں کا حساب کتاب رکھتے۔اُن سے کوئی غلطی سرزد ہوتی تو انہیں اس کی طرف توجہ دلاتے اور اس طرح حساب کتاب درست کر دیتے۔اُن کے لئے بینک سے پیسے نکلوا کر لاتے۔لفافے میں رکھ کر انہیں یہ پیسے دیتے۔میں نے تو کبھی اُن کے لائے ہوئے پیسوں کو گنا نہیں۔اس لئے کہ مجھے گننا نہیں آتا۔لیکن اس میں وہ اعتماد بھی تھا جو مجھے مہر دین پر تھا۔مہر دین سے اس معاملے میں کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ہمیشہ اُن کا حساب کتاب ٹھیک اور نوک پلک سے درست رہا۔

Marfat.com

مہردین بڑے ہی مُستعد اور باقاعدہ آدمی تھے۔ یہ خصوصیت تو گویا اُن کی گھُٹی میں پڑی تھی۔ اُن کا ہر کام صحیح اور مُکمّل ہوتا تھا۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ وہ پروفیسر جو لکھنے پڑھنے میں زیادہ وقت گُذارتے ہیں، اُن سے دفتری کاموں میں بھول چوک ضرور ہوتی ہے۔ کبھی ایسا موقع آتا، اور ایسے مواقع اکثر آتے تھے، تو مہردین ایسے پروفیسروں کی ایسی غلطی پکڑتے، اور نہایت ادب اور احترام کے ساتھ اس کی طرف توجہ دلاتے۔

میری پرنسپلی کے زمانے میں مہردین ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچے۔ میرا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی ملازمت سے ریٹائر ہوتا تو میں اس کو اپنے کمرے میں بُلاتا اور اس سے پوچھتا کہ "مجھے بتاؤ کہ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟ تمہارا کوئی بیٹا ہو تو تمہاری جگہ اس کو تمہاری پوسٹ پر ملازم رکھ لیا جائے"۔

جب مہردین کی فائل میرے پاس آئی تو میں نے مہردین کو بُلایا، اور اُن سے پوچھا کہ "میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں"؟

مہردین نے کہا "میری کوئی خواہش نہیں، ملازمت ختم ہونے کے بعد بھی ہمیشہ کی طرح میں اورینٹل کالج میں آتا رہوں گا۔ آپ مجھے اس کی اجازت دیجئے۔ گذر بسر ہو ہی جائے گی"۔

میں نے مہردین سے کہا "آپ کبھی ریٹائر نہیں ہوں گے۔ آپ کے بغیر اورینٹل کالج کچھ سُونا سُونا سا لگے گا۔ اس لئے میں نے کچھ ایسی صورت نکالی ہے کہ آپ اسی طرح کام کرتے رہیں گے جس طرح چالیس سال تک کام کرتے رہے ہیں۔ تنخواہ جتنی آپ کو ملتی تھی، اس سے کچھ زیادہ ہی رقم آپ کو ہر مہینے ملتی رہے گی۔ میں نے اس کا انتظام کر دیا ہے۔

مہردین میری یہ بات سُن کر خوش ہوئے، زیرِ لب مُسکرائے اور کمرے سے باہر چلے گئے، اور دفتر میں جا کر اپنے تمام رفقاء کو یہ خوش خبری سُنا دی۔ وہ سب بھی بہت خوش ہوئے۔

اُن کے جانے کے بعد میں نے دفتر کے سپرنٹنڈنٹ اصغر قریشی صاحب کو بُلایا، اور اُن سے کہا کہ "میں نے مہردین کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ "وہ کاغذ پر تو ریٹائر ہو جائیں گے، لیکن ویسے ریٹائر نہیں ہوں گے۔ روزانہ ہمیشہ کی طرح کالج آتے رہیں گے اور کام کرتے رہیں گے۔ میگزین، اسپورٹس، اور مطبوعات کے فنڈز سے انہیں الاؤنس کی اتنی رقم ملتی رہے گی جتنی

Marfat.com

کہ اُن کی تنخواہ ہے۔کچھ میں بھی دوں گا۔کچھ اساتذہ بھی دیں گے۔اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیئے مناسب کاروائی کیجیئے"۔

اصغر قُرشی صاحب نہایت نیک، شریف، مخلص، انسان دوست، دین دار، پابند صوم و صلوٰۃ اور محبت والے آدمی تھے۔میرے اس فیصلے کی تفصیل سُن کر بہت خوش ہوئے۔دیر تک دعائیں دیتے رہے۔اساتذہ نے بھی میرے اس فیصلے سے اتفاق کیا۔دفتر کے لوگ بھی خوش ہوئے۔اور اس طرح میاں مہر دین اورینٹل کالج سے کبھی ریٹائر نہیں ہوئے۔

آج بھی وہ ہمیشہ کی طرح کالج آتے ہیں، اور صبح سے شام تک اورینٹل کالج میں مشغول و مستعد رہتے ہیں۔کیونکہ اُن کی زندگی محبت و خدمت، جہد مسلسل اور جذب و جنوں سے عبارت ہے۔وہ تو ایک دریائے نرم خرام ہیں، بہتے ہوئے پانی کا ایک چشمۂ شیریں ہیں، ایک ایسا آبشار ہیں جس کا عمل کبھی رکتا نہیں، جس کا پانی کبھی سوکھتا نہیں، جس کی نغمگی کبھی ختم نہیں ہوتی، اور جو اپنی دُھن میں مگن، شاداں و فرحاں ہمیشہ اور ہر حال میں زندگی کے راستے پر رواں دواں رہتا ہے۔

Marfat.com

ڈاکٹر عبادت بریلوی

کی

کتابیں

اقبالیات

۱۔ جشن نامۂ اقبال (اردو)	شائع کردہ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۲۔ جشن نامۂ اقبال (انگریزی)	〃
۳۔ اورینٹل کالج میگزین اقبال نمبر (اردو)	〃
۴۔ اورینٹل کالج میگزین اقبال نمبر (انگریزی)	〃
۵۔ اقبال کی اردو نثر	اقبال اکیڈمی، لاہور
۶۔ اقبال ــــ احوال و افکار	مکتبۂ عالیہ، لاہور
۷۔ جہانِ اقبال (ادبی سوانح) (زیرِ طبع)	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۸۔ اقبال کی غزل	〃
۹۔ منظوماتِ اقبال	〃
۱۰۔ اقبال کا فن	〃

ادبی دریافت (نادر قلمی نسخوں کی دریافت اور ترتیب و تدوین)

۱۱۔ شکنتلا، مولفہ مرزا کاظم علی جوان (مع مقدمہ)	اردو دنیا، کراچی
۱۲۔ ہفت گلشن، مولفہ مظہر علی خاں ولا	〃
۱۳۔ مادھونل اور کام کندلا	〃 〃
۱۴۔ دیوان ولی	〃 〃 ادارۂ ادب و تنقید، لاہور

Marfat.com

۱۵۔ گلزار چین مولفہ خلیل علی خاں اشک (مع مقدمہ)	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۱۶۔ رسالۂ کائنات 〃	〃
۱۷۔ شکوۂ فرنگ مولفہ آغا جو شرف	〃
۱۸۔ چار گلشن، مولفہ بینی نرائن جہاں	〃
۱۹۔ دیوانِ مبتلا، مولفہ عبید اللہ خاں مبتلا	〃
۲۰۔ دیوان حیدری، مولفہ سید حیدر بخش حیدری	〃
۲۱۔ مختصر کہانیاں 〃	〃
۲۲۔ تذکرہ گلشن ہند 〃	〃
۲۳۔ گلزار دانش (دفتر اول) 〃	〃
۲۴۔ گلزار دانش (دفتر دوم) 〃	〃
۲۵۔ مرقع مخلص، مولفہ آنند رام مخلص (مع مقدمہ و حواشی)	〃
۲۶۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی انگریزی نظمیں، مولفہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ	〃
۲۷۔ نقلیات ہندی جلد اول و دوم 〃	〃
۲۸۔ افسانۂ عشق، مولفہ الٰہی بخش شوق اکبر آبادی مع مقدمہ	〃
۲۹۔ سیاحت نامہ، مولفہ نواب کریم خاں مع مقدمہ	〃
۳۰۔ نالۂ درد، مولفہ حضرت خواجہ میر درد (اردو ترجمہ مع مقدمہ)	〃
۳۱۔ نکات الشعراء، مولفہ میر تقی میر (مع مقدمہ و حواشی	〃
۳۲۔ دیوان فارسی، مولفہ حضرت خواجہ میر درد 〃	〃
۳۳۔ جشن نامہ اورینٹل کالج (جلد اول)	〃
۳۴۔ جشن نامہ اورینٹل کالج (جلد دوم)	〃
۳۵۔ خطوط عبدالحق بنام عبداللہ چغتائی (مع مقدمہ و حواشی)	〃

تحقیق و تنقید

۱۔ تنقید کا ارتقا : انجمن ترقی اردو، پاکستان کراچی

Marfat.com

۳۷	روایت کی اہمیت	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی
۳۸	غزل اور مطالعہ غزل	"
۳۹	خطبات عبدالحق : مع مقدمہ	"
۴۰	مقدمات عبدالحق : مع مقدمہ	اردو مرکز لاہور
۴۱	انتخاب خطوط غالب "	"
۴۲	تنقیدی زاویے (پہلا ایڈیشن)	مکتبۂ اردو لاہور
	(دوسرا ایڈیشن)	اردو مرکز لاہور
۴۳	تنقیدی تجربے	اردو دنیا کراچی
۴۴	مومن اور مطالعۂ مومن	"
۴۵	جدید شاعری	"
۴۶	کلیات میر (مع مقدمہ)	"
۴۷	کلیات مومن "	"
۴۸	شاعری اور شاعری کی تنقید	"
۴۹	سحرالبیان — ایک تنقیدی مطالعہ	اورینٹل کالج، لاہور
۵۰	غالب اور مطالعۂ غالب	رائٹرز اکیڈمی، لاہور
۵۱	غالب کا فن	گلوب پبلشرز، لاہور
۵۲	اقبالؒ کی اردو نثر	اقبال اکیڈمی، لاہور
۵۳	اقبالؒ — احوال و افکار	مکتبۂ عالیہ، لاہور
۵۴	میر تقی میر (حیات اور شاعری)	ادارۂ ادب و تنقید، لاہور
۵۵	ولی اورنگ آبادی "	"
۵۶	پاکستان کے تہذیبی مسائل	"
۵۷	حضرت خواجہ میر دردؒ	"
۵۸	ادب اور ادبی قدریں	"

Marfat.com

ڈاکٹر عبادت کی نئی کتابیں

ترکی میں دو سال

ترکی کا سفرنامہ جو پاکستان کے برادر ملک ترکی کی تعلیمی، علمی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی تصویروں کا ایک حسین و دلآویز مرقع ہے۔ قیمت: چالیس روپے

○

دیارِ حبیبؐ میں چند روز

سعودی عرب کا سفرنامہ، جس میں عمرہ اور حج کی تفصیل ہے اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اور دوسرے مقدس مقامات کا حال جذب و شوق کے ساتھ لکھا گیا ہے۔
قیمت: پچاس روپے

○

یادِ عہدِ رفتہ

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے خود نوشت حالات اس میں گذشتہ نصف صدی کے حالات کی تفصیل ہے۔ قیمت: ڈیڑھ سو روپے

○

آزادی کے سائے میں

قیام پاکستان کے وقت کی خوں چکاں داستان کی تفصیل
قیمت: ۷۵ روپے

○

اورینٹل کالج میں تیس سال اور "بلاکشانِ محبت" (زیرِ طبع)

Marfat.com

Marfat.com

ڈاکٹر عبادت بریلوی

یارانِ دیرینہ

اِدارۂ ادب و تنقید، لاہور

2291

Marfat.com